اردو ترجمہ

# مُقدّمۃ التفسیر

تالیف: امام راغبؒ اصفہانیؒ

ترجمہ: مولانا محمدّ اشرف قریشی

تقدیم ونظرِ ثانی: معراج محمدّ بارق

پانچویں صدی ہجری کے مفسرِ قرآن اور ماہرِ لغت کے قلم سے بصیرت افروز تفسیری نکات اور بیش بہا علومِ قرآنی پر مشتمل جامع رسالہ کا مستند اردو ترجمہ۔



قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ۔ کراچی ۱

اردو ترجمہ

# مقدمۃ التفسیر

تالیف: امام راغب اصفہانیؒ

ترجمہ: مولانا محمد اشرف قریشی

تقدیم و نظرِ ثانی: معراج محمد بارق

پانچویں صدی ہجری کے مفسرِ قرآن اور ماہرِ لغت کے قلم سے بصیرت افروز تفسیری نکات اور بیش بہا علومِ قرآنی پر مشتمل جامع رسالہ کا مستند اردو ترجمہ۔

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ۔ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ ناشر

امام راغب اصفہانیؒ ایک مفسر قرآن، ادیب، نحوی، ماہرِ لغت، حکیم اور ماہرِ اخلاقیات کی حیثیت سے علمی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی صرف چند تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہیں۔ باقی تالیفات یا تو مخطوطات کی شکل میں ہیں یا ضائع ہو چکی ہیں۔ لیکن یہ جو چند تصانیف طبع ہو کر کتابی شکل میں سامنے آئی ہیں وہ اپنے اپنے فن میں رائد و قائد کا درجہ رکھتی ہیں۔

المفردات فی غریب القرآن، الذریعۃ الیٰ مکارم الشریعۃ، محاضرات الادباء اور تفصیل النشأتین، یہ سب ایسی تصانیف ہیں کہ ان سے متعلقہ موضوعات پر قلم اٹھانے والا یا ان فنون کا متعلم امام راغبؒ کی اِن تصانیف کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

یہی مقام ان کے رسالہ "مقدمۃ التفسیر" کا ہے جو دراصل ان کی "جامع التفاسیر" کا مقدمہ ہے۔ یہ رسالہ اگرچہ حجم میں چھوٹا ہے لیکن ایسے اہم اصولِ تفسیر اور بصیرت افروز تفسیری نکات پر مشتمل ہے کہ علومِ قرآنی کا طالب علم ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب، مفسر اور لغوی ہونے کی حیثیت سے علّامہ راغب اصفہانیؒ نے اس رسالہ میں بعض اہم تفسیری مباحث ایسے اچھوتے انداز میں اور ایسے ایجاز و اختصار سے بیان کیے ہیں کہ ان کی مثال اور جگہ مشکل سے ملتی ہے، البتہ ان مباحث کی کچھ جھلک اور اس اندازِ بیان کا پرتو ہمیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیف

"الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے پانچویں صدی ہجری کے عبقری امام راغبؒ کے تفسیری نکات کا موازنہ بارہویں صدی کے نابغہ مفکر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اصولِ تفسیر سے کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ خصوصاً تفسیر و تاویل کی لغوی اور اصطلاحی بحث، حقیقت و مجاز کے مسائل، انتشارِ ضمیر کے مباحث، اعجاز القرآن کا بیان، ناسخ و منسوخ کی بحث، قرآن مجید کے اندازِ بیان کی پیچیدگیوں کا حل، کلامِ الٰہی کے شعر نہ ہونے کا مسئلہ، بظاہر متضاد آیات میں تطبیق دینے کا اصول، کلامِ الٰہی کی نوعیت، اور مفسر کے لیے ضروری علوم اور لازمی صفات و شرائط۔ یہ اور ایسے دیگر کئی موضوعات ہیں جن پر ان دونوں مفسرین نے اپنے اپنے انداز میں گفتگو کی ہے۔ لیکن ان دونوں کے خیالات و نظریات میں کہیں تو بہت مماثلت نظر آتی ہے اور کہیں اختلاف ملتا ہے، اور بعض مقامات پر یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

انہی حقائق کے پیشِ نظر ہماری رائے ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی "الفوز الکبیر" پڑھنے والے کو امام راغبؒ کے "مقدمۃ التفسیر" کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہیئے تاکہ اس فن کے بعض پہلو جو ایک رسالہ میں تشنہ رہ گئے ہوں یا ایجاز و اختصار کی وجہ سے واضح نہ ہوسکے ہوں وہ دوسرے رسالہ کے مطالعہ سے واضح ہوجائیں۔ اسی مقصد کے تحت ہم نے امام راغبؒ کے "مقدمۃ التفسیر" کے عربی متن کو شاہ ولی اللہؒ کی "الفوز الکبیر" کے عربی متن کے ساتھ ملحق کرکے شائع کردیا ہے تاکہ عربی داں قارئین ان دونوں رسالوں سے بیک وقت مستفید ہوسکیں۔

ایسی ہی ضرورت ہم نے اُردو داں حضرات کے لیے محسوس کی، اور "الفوز الکبیر" کا اردو ترجمہ شائع کرنے کے بعد "مقدمۃ التفسیر" کا آسان اردو زبان میں ترجمہ کرایا۔ یہ رسالہ ماہرِ بلاغت امام راغبؒ کی دیگر تحریروں کی طرح ایجاز و بلاغت کا نمونہ ہے،

ہمارے دوست مولانا محمد اشرف قریشی صاحب نے اس کا اردو ترجمہ نہایت آسان زبان اور واضح انداز میں کیا ہے تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس کے تفسیری نکات سے بآسانی مستفید ہو سکے اور عربی داں حضرات کو بھی اس کے بعض مشکل مقامات حل کرنے اور پیچیدہ مباحث سمجھنے میں سہولت ہو۔

رسالہ کے شروع میں اس کے مطالب ومباحث کی ایک مفصّل فہرست بھی شامل کی جارہی ہے جو امید ہے کہ اس کتاب سے استفادہ کرنے میں مزید معاون ثابت ہوگی۔ وباللہ التوفیق

خادم العلم والعلماء
معراج محمد
مہتمم قدیمی کتب خانہ

# فہرست مضامین

---

# مختصر سوانح علامہ راغب اصفہانیؒ

**اسم ونسب**
حسین بن محمد بن المفضل نام اور ابو القاسم کنیت ہے، لیکن آپ راغب اصفہانی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔

**ولادت اور نشوونما**
علامہ نے اپنے زمانہ میں اور وفات کے بعد اپنی مفید تالیفات اور علم کے ذریعہ کافی شہرت حاصل کی لیکن افسوس ہے کہ آپ کی پیدائش، جائے ولادت اور تعلیم و تربیت کے زمانہ کے متعلق تاریخ اور سوانح کی کتابوں میں کوئی قابل اطمینان اور یقینی بات نہیں ملتی ہے۔ استاد محمد کرد علی نے اپنی کتاب "کنوز الاجداد" میں اس کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ چونکہ علامہ اصفہانیؒ کا تعلق سلاطین اور امورِ سلطنت سے نہیں رہا، اس لیے آپ کے ابتدائی حالات اتنے زیادہ مشہور نہیں ہوئے، آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی یہاں تک کہ طبقات کی کتابوں میں بھی آپ کا ذکر نہیں آیا۔ چونکہ علامہ کی اصفہان شہر کی طرف نسبت ہے اور اصفہان شہر علماء کا مرکز تھا، محدثین، مؤرخین اور ہر فن کے قابل قدر علماء یہاں پیدا ہوئے ہیں، اس لیے غالب گمان ہے کہ آپ نے اصفہان میں تعلیم حاصل کی ہوگی۔

علامہ کی وفات کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ آپ کی وفات ۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء میں ہوئی ہے۔

**شہرت اور القاب**
روضات الجنات کے مصنف خوانساری نے آپ کا تذکرہ ان صفات کے ساتھ کیا ہے کہ آپ امام، ادیب، حافظ، لغتِ عربی، حدیث، شعر، اخلاق، فلسفہ، علم کلام اور متقدمین کے علوم کے ماہر تھے۔ آپ کی شہرت اور صفات بیان کی محتاج نہیں ہیں۔

علامہ بیہقیؒ نے اپنی کتاب حکماء الاسلام میں موصوف کے بارے میں فرمایا کہ:

آپ اسلام کے حکماء میں سے تھے اور آپ نے اپنی تصانیف میں شریعت اور حکمت کے درمیان تطبیق دی ہے۔ جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیہ میں کہا ہے کہ آپ فقیہہ اور لغت و ادب کے عالم تھے، آپ کو وسیع علم حاصل تھا جس کی بدولت آپ نے مفید کتابیں تصنیف کیں۔ "تفصیل النشأتین و تحقیق السعادتین" کے مقدمہ میں آپ کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ "غرض یہ کہ تمام بڑے بڑے علماء نے اپنے مذہبی اختلافات کے باوجود امام راغب کی فضیلت پر اجماع کیا ہے"۔ استاد محمد کرد علی نے آپ کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے کہ "یہ شریعت کے عظیم شخص اور کامل عقل والے انسان کی سیرت کا خلاصہ ہے۔ ہم ان کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں علماء نے بتایا ہے اور علماء نے ہمارے سامنے ابتداء ہی سے ان کی عظمت و فضیلت کی تصویر پیش کی ہے"۔

**نظریۂ علامہ**

علامہ کو اللہ تعالیٰ نے کامل عقل و بصیرت اور وسیع علم عطا فرمایا تھا۔ آپ کو متعارض اقوال میں تطبیق دینے کا ایک خاص ملکہ حاصل تھا آپ جب ایک مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو اس کے بارے میں جتنے اقوال ملتے ہیں ان سب کا ذکر کرتے ہیں اور ہر ایک کی دلیل بیان کرتے ہیں اور جس قول کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہو اُسے تو رد کر دیتے ہیں لیکن تمام اقوال کو رد نہیں کرتے۔ مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی امکانی تقسیم کرتے ہیں، اور ان میں جو باریک فرق ہوتا ہے اس کی وضاحت کرتے ہیں اور جزئی اختلاف کو اصول پر پیش کرتے ہیں پھر غیر جانبداری کے ساتھ بلا تعصب اصل مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ آپ کی کتابیں آپ کے اس طرز عمل کی دلیل ہیں اور زیر نظر کتاب بھی اس کی ایک مثال ہے۔ آپ کے اسی طرز عمل کی وجہ سے بعض علماء کو آپ کے نظریہ کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔ یہاں تک کہ علامہ سیوطیؒ اپنے وسیع مطالعہ کے باوجود ابتداء میں آپ کو معتزلی سمجھتے تھے لیکن

جب انہوں نے علامہ بدرالدین زرکشیؒ کی ایک تحریر دیکھی، جس میں لکھا تھا کہ "امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی کتاب تاسیس التقدیس میں ذکر کیا ہے کہ ابوالقاسم راغب اہل سنت کے ائمہ میں سے ہیں اور علامہ غزالیؒ کے ہمعصر ہیں" اس کے بعد علامہ سیوطیؒ کی غلط فہمی دور ہوئی۔ (بغیۃ الوعاۃ)

علامہ خوانساری نے اپنی کتاب روضات الجنات میں آپ کو اہلِ سنت میں سے علامہ اشعریؒ کا متبع قرار دیا ہے اور اس کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ آپ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ جبر کی تحقیق کرتے ہوئے اشاعرہ کے مذہب کی تائید کی ہے اور معتزلہ کے مذہب کو ضعیف قرار دے کر اسے رد کیا ہے۔

علامہ کو اہل بیت اور حضرت علیؓ سے بھی دلی تعلق تھا اور آپ نے اپنی کتابوں میں اہلِ بیت کا بڑی عظمت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ اسی تذکرہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے آپ کو شیعہ مان لیا۔ مثلاً شیخ طبرسی نے آپ کو شیعہ امامیہ کے حکماء میں شمار کیا ہے۔ لیکن اس دلیل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اصل میں آپ نے فرقہ نواصب کی پُرزور تردید کرتے ہوئے حضرت علیؓ اور اہل بیت کی مدح کی ہے۔ صرف اہلِ بیت سے محبت شیعیت کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ تو ایمان کی نشانی ہے۔ شیعیت ایک مستقل مذہب ہے اس کے اصول و فروع اہلِ سنت سے جدا ہیں اور علامہ موصوفؒ شیعوں کے ساتھ نہ ان کے اصولوں میں موافق ہیں اور نہ فروع میں۔ ہاں یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ کو ہر طبقہ میں قبولیت حاصل تھی۔

## علامہ کی تصنیفات

علامہ نے مفید کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ آپ کی کتابوں میں سے چند کتابیں طبع ہوئی ہیں اور یہی بہت زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ (۱) مفردات القرآن (۲) الذریعہ الیٰ مکارم الشریعۃ (۳) محاضرات الادباء و محاورات الشعراء والبلغاء (۴) تفصیل النشأتین و

تحصیل السعادتین (۵) مقدمۃ التفسیر۔ استاد محمد کرد علی آپ کی ان کتابوں پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "کیا قرآن کریم کے رازوں کا طالب "مفردات راغب" سے بے نیاز ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی فقیہہ شریعت کے احکام اور اس کی حکمتوں کو علم وعمل میں جمع کرنا چاہے تو کیا اس کی ضرورت الذریعہ الی مکارم الشریعۃ کے بغیر پوری ہو سکتی ہے؟ اور کیا کوئی ادیب محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء کے بغیر ادب میں کمال حاصل کر سکتا ہے اور کیا کوئی طالب علم تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین کے پڑھنے سے بے نیاز ہو سکتا ہے؟"

علامہ اپنی کتابوں میں اپنی جانب سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ علم وادب کے حوالہ سے کلام کرتے ہیں۔ اگر ہم علامہ کی مذکورہ چار کتابوں پر ہی غور کریں اور ان کے فوائد کا جائزہ لیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ ان کتابوں میں قرآن کریم کی آیتوں سے مسائل و نکات کا بہترین استخراج اور ان کا برمحل استعمال کیا گیا ہے۔

آپ کی کتابوں کا خاص امتیاز یہ ہے کہ آپ اپنی کتابوں میں شریعت اور عقل کو تطبیق دیتے ہیں۔ مسائل کو مختلف فصلوں میں تقسیم کر کے سہل عبارت کے ساتھ بڑی بلاغت سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مسائل خود بخود ذہن نشین ہوتے جاتے ہیں، اور کوئی اشکال باقی نہیں رہتا اسی وجہ سے طبیعت بھی ان کی طویل عبارتوں کو پڑھنے سے نہیں گھبراتی۔ زیر نظر کتاب (مقدمۃ التفسیر) اس کی واضح مثال ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے بغیۃ الوعاۃ میں ان کی کتاب الذریعہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ "امام غزالیؒ اس کتاب کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اور اس کے نفیس مضامین کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے"۔ یہ چاروں کتابیں شائع ہو کر نافع الخلائق بنی ہوئی ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی بہت سی تصانیف مخطوطہ کی شکل میں ہیں۔ ان میں سے

کچھ کی تفصیل ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) تحقیق البیان : استاد اسعد طلس نے اس مخطوطہ کے بارے میں فرمایا کہ علّامہ راغب کی یہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر اور نہایت عمدہ ہے۔ اس میں عربی لغت، اخلاق اور حکمت کی باتیں ہیں لیکن اس مخطوطہ کا اوّل حصّہ موجود نہیں ہے۔

(۲) افانین البلاغۃ : علّامہ راغب نے اس کا ذکر جماع البلاغۃ کے نام سے کیا ہے۔

(۳) درّۃ التاویل وغرّۃ التنزیل : اس کا دوسرا نام "حلّ متشابہات القرآن" بھی ہے۔

(۴) رسالۃ منبہۃ علیٰ فوائد القرآن : علّامہ راغبؒ نے مفردات کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(۵) تحقیق الالفاظ المترادفۃ علی المعنی الواحد : اس کا ذکر بھی مفردات کے مقدّمہ میں آیا ہے۔

(۶) کتاب الاخلاق : اس کا موضوع علم الاخلاق ہے۔

(۷) الایمان والکفر : صاحبِ "روضات" نے اس کے بارے میں فرمایا ہے "کہ اس کا طرزِ تحریر بے نظیر ہے، اس کا فائدہ عمدہ ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ علّامہ راغب اشعری ہیں"۔

(۸) جامع التفاسیر : اس کے بارے میں علّامہ سیوطیؒ نے بغیۃ الوعاۃ میں فرمایا ہے کہ یہ ایک قابلِ اعتماد تفسیر ہے۔ اس کے شروع میں ایک مقدّمہ ہے جس میں تفسیر سے متعلّق مفید باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ تفسیر کا طرز یہ ہے کہ چند آیات ذکر کرنے کے بعد ان کی پوری تحقیق سے تفسیر کی گئی ہے۔ علّامہ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں جابجا اس سے استفادہ کیا ہے۔ علّامہ فیروز آبادیؒ نے فرمایا کہ یہ دس جلدوں

میں انتہائی تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس تفسیر کے مختلف حصّوں کے مخطوطے دنیا کے مختلف عجائب خانوں اور کتب خانوں میں ملتے ہیں لیکن ابھی تک یہ تفسیر مکمل نہیں مل سکی۔

اس تفسیر کا مقدّمہ بقول علّامہ سیوطیؒ کثیر تفسیری فوائد پر مشتمل ہے۔ اسی مقدّمہ کا ترجمہ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے آپ کو علّامہ راغبؒ کی وسعتِ علمی اور طرزِ بیان کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

---

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر میں ہم اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، نبی محمد اور ان کے ساتھیوں پر درود ہو۔ ہم اللہ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے کر دے جن کے ساتھ اس نے ابتداء میں نعمت و فضل کا اور آخر میں رحم کا معاملہ کیا اور یہ کہ ہمیں اس جماعت میں شامل کر دے جن پر عصمت انبیاء کی روشنی ڈالی اور ان کے دلوں کو پاکیزگی کے ذریعہ محفوظ کر دیا۔ وہی اپنے ارادہ کو پورا کرنے والا ہے۔

شیخ ابو القاسم راغبؒ نے فرمایا: اگر اللہ نے ہماری عمر کو قیمتی بنایا اور ہمیں زمانہ کی مصیبتوں سے بچایا اور اسی سے ان آرزوؤں کے پورا ہونے کی امید ہے، تو اس (مضمون کو) املاء کرانے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر و تاویل میں سے ایسے اعلیٰ نکات بیان کریں جو صحابہؓ، تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کے اقوال و اشارات کی تفصیل پر مشتمل ہوں اور ہم ان کو ایسا بیان کریں جس سے سربستہ راز کھل جائیں اور دلوں کو اطمینان حاصل ہو جائے۔

اللہ ہمیں اپنی رحمت سے اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے، ہماری کوشش میں برکت دے، اور دونوں جہاں میں ہمارے کام کو محمود و مقبول بنائے۔ اسی سے توفیق کی ابتداء و انتہاء حاصل کی جاتی ہیں۔

# مفرد اور مرکب کلام کی وجہ سے اشتباہ ہونے کا بیان

کلام کی دو قسمیں ہیں: مفرد اور مرکب۔ مفرد کو اسم، فعل اور حرف کہتے ہیں۔ مفرد کے یہ اصطلاحی نام ہیں حالانکہ اصل میں ان سب کا ایک ہی نام اسم ہے۔ مفرد کی تین قسمیں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کلام کے بارے میں خبر دی گئی ہے تو اس کو اسم کہیں گے اور اگر وہ خود خبر ہے تو اس کو فعل کہیں گے اور اگر وہ ان دونوں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہے تو اس کو حرف کہیں گے۔ کلام کی تقسیم اسی کا تقاضا کرتی ہے۔ خبر کی قسموں میں سے جو فَاعِلٌ اور مَفْعَلٌ وغیرہ ہیں تو بصرہ کے نحوی علماء انہیں لفظی احکام کے پیش نظر اسم کہتے ہیں کیونکہ ان پر تنوین، جر، حروف جارہ اور الف لام داخل ہوتے ہیں مزید یہ کہ ان کے بارے میں خبر دی جاتی ہے اور یہ سب اسم کی صفات ہیں۔ جبکہ کوفہ کے نحوی علماء فَاعِلٌ و مَفْعَلٌ وغیرہ کو فعل دائم کہتے ہیں۔ وہ ان کو فعل معنی کی مناسبت سے کہتے ہیں۔ کیونکہ مثلاً "قائم" فاعل ہے اور اس میں "یقوم" یعنی کھڑے ہونے کے معنی موجود ہیں۔ اس کو دائم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں زمانوں کی صلاحیت رکھتا ہے اگرچہ اکثر مواضع میں اس کے لئے حال کے معنی زیادہ مناسب ہوتے ہیں۔

الفاظ میں اصل تو یہ ہے کہ مختلف معانی کے لئے مختلف الفاظ ہوں یعنی ہر ایک معنی کے لئے ایک مستقل لفظ ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے، کیونکہ معانی لامحدود ہیں جبکہ الفاظ اپنی مختلف مرکب صورتوں کے باوجود محدود ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی لامحدود چیز محدود چیز میں نہیں سما سکتی لہذا (ہر زبان میں) ایسے الفاظ ضرور پائے جاتے ہیں جو متعدد معنی میں مستعمل ہوں۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ معنی کے تعلق سے الفاظ کے پانچ حالات ہیں:۔

پہلا[1] حال:۔ لفظ اور معنی دونوں متفق ہوں اس کو متواطی لفظ کہتے ہیں جیسے لفظ انسان جو کہ زید اور عمر کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے یعنی زید اور عمر دونوں انسان کے لفظ اور معنی میں متفق ہیں۔

دوسرا[2] حال:۔ لفظ اور معنی دونوں میں اختلاف ہو جیسے مرد اور گھوڑا۔ اسے متبائن کہتے ہیں۔

تیسرا[3] حال:۔ صرف معنی میں متفق ہوں۔ اسے مترادف کہتے ہیں جیسے حُسام اور صَمْصَام۔ ان دونوں کے معنی تلوار ہیں۔

چوتھا[4] حال:۔ لفظ میں تو متفق ہوں لیکن معنی میں اختلاف ہو۔ اسے مشترک اور متفق کہتے ہیں جیسے لفظ عَیْنٌ جو کہ آنکھ، پانی کا چشمہ، نگہبان جاسوس وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پانچواں[5] حال:۔ کچھ لفظ میں متفق ہوں اور کچھ معنی میں۔ اسے مشتق کہتے ہیں جیسے ضَارِبٌ اور ضَرَبَ یہ دونوں "مارنے" کے معنی اور "ض رب" کے الفاظ میں متفق ہیں لیکن کچھ معنی اور کچھ الفاظ میں مختلف بھی ہیں۔

ان پانچ اقسام میں سے مشترک اور متواطی الفاظ میں یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ عام ہے یا خاص، اور مشتق لفظ کی اصل معلوم کرنے میں اشتباہ ہوتا ہے۔ جیسے لفظ نبیّ اور بریّۃ کے بارے میں بعض علماء کہتے ہیں کہ "نبی" "اَنْبَأَ" سے، اور بریّۃ "بَرَأَ" سے بنا ہے، اصل کلمہ میں ہمزہ تھی لیکن استعمال میں متروک ہو گئی جبکہ بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ نبی "نُبُوَّۃ" سے مشتق ہے، بمعنی بلندی، اور بریّۃ "برا" سے مشتق ہے یعنی مٹی۔

# مشترک لفظ کی صفات

دو لفظوں میں اشتراک اسی وقت ہوگا جبکہ وہ حروف کی ترتیب، تعداد اور ان کی حرکات میں متفق ہوں لیکن معنی میں مختلف ہوں۔ جیسے لفظ عَیۡنٌ اور لفظ کَلۡبٌ۔ (ان میں سے ہر ایک مختلف معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے)۔

اگر ان کے حروف کی ترتیب مختلف ہو جیسے "حلم" اور "حمل"، یا ان کے حروف کی تعداد میں اختلاف ہو جیسے "الغنار" بلا مشدّد اور "الغنّار" مشدّد۔ اسی طرح "مَقدَر" اور "قَدّر"، یا ان کی حرکات میں اختلاف ہو جیسے "قَدِمَ" اور قَدُمَ"، یا ان کے معنی مختلف نہ ہوں جیسے "انسان" جو زیدؔ اور عمرؔ کے لئے استعمال کیا جاتے (یعنی زیدؔ اور عمرؔ دونوں انسان ہیں) تو ان تمام صورتوں میں لفظ مشترک نہیں ہوگا۔

جن دو لفظوں کے حروف کی تعداد مختلف ہو، ان میں سے بعض مشترک ہوتے ہیں جیسے "ضارب" اور "ضرب" (پہلا لفظ چار حرفی اور دوسرا لفظ تین حرفی ہے اور دونوں الفاظ "مارنے" کے معنی میں مشترک ہیں)۔ اور بعض متباین ہوتے ہیں جیسے لفظ "قنا" (جمع قَنَاۃٌ کی بمعنی نیزہ) اور "قنابل" (جمع قَنۡبَلٌ کی بمعنی گروہ)۔

اور بعض دو الفاظ صورۃً لفظوں میں مشترک ہوتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ مشتق ہوتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی اصل مختلف ہوتی ہے جیسے لفظ "مُخۡتَارٌ" بمعنی پسند کرنے والا اور پسندیدہ لیکن فاعل کے معنی میں اس کی اصل مُخۡتَیِرٌ بروزن مُفۡتَعِلٌ ہے اور مفعول کے معنی میں اس کی اصل مُخۡتَیَرٌ بروزن مُفۡتَعَلٌ ہے۔ اسی طرح فَلَانٌ مُنۡحَلٌّ یعنی فلاں گرہ کھولنے والا (اسم فاعل باب انفعال سے) اور اَمۡرٌ مُنۡحَلٌّ فِیۡہِ یعنی اس میں کمزور کرنے والا کام (اسم فاعل باب افعال

سے) اور لفظ "فُلْکٌ" بمعنی کشتی، اگر یہ واحد ہو تو "قُفْلٌ" کے وزن پر ہے اور اگر جمع ہو تو "وُثْنٌ" کے وزن پر ہے۔ اور جیسے "نَاقَۃٌ هِجَانٌ" بمعنی سفید بالوں والی اونٹنی، اور "اِمْرَأَۃٌ ضِنَاكٌ" تواناعورت، یہ دونوں الفاظ یعنی هِجَان اور ضِنَاك اگر واحد ہوں تو حِمَار کے وزن پر ہیں اور اگر جمع ہوں جیسے "نُوقٌ هِجَانٌ" (سفید بالوں والے اونٹ یا اونٹنیاں) تو اس وقت کِرَام کے وزن پر ہوتے ہیں۔ اسی طرح لفظ "یَغْزُوْنَ" یہ جمع مذکر غائب اور جمع مؤنث غائب دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اگر مذکر ہو تو اس کی اصل یَغْزُوُوْنَ بروزن یَخْرُجُوْنَ ہے اور مؤنث ہو تو اس کی اصل یَغْزُوْنَ بروزن یَخْرُجْنَ ہے۔ نیز لفظ "تَعْصِیْنَ" یہ واحد مؤنث حاضر اور جمع مؤنث حاضر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن جب واحد ہو تو یہ تَفْعَلِیْنَ کے وزن پر ہے اور جمع ہو تو تَفْعَلْنَ کے وزن پر ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ "دُبُرٌ" یہ دَبَرَ کا مصدر بھی ہے اور دَابِر کی جمع بھی ہے جیسے لفظ رُکُوْبٌ کہ رَکِبَ کا مصدر اور رَاکِب کی جمع ہے۔

بہت سے ایسے الفاظ ہیں کہ لفظ کا صیغہ ایک ہے لیکن اس کے معنی مختلف ہیں اور ہر معنی کی اصل مختلف ہے۔ جیسے لفظ "مِصْبَاحٌ" بمعنی چراغ اور وہ بڑا پیالہ جس میں صبح کے وقت شراب پی جاتی۔ لیکن پہلے معنی کے لئے اس کی اصل صَبَحْتُ یعنی میں نے ظاہر کیا اور دوسرے معنی کے لئے اس کی اصل صَبُوْح ہے یعنی وہ دودھ جو صبح کے وقت پئیں۔ اور جیسے لفظ "اِشْتَکٰی" یہ رنج و مصیبت ظاہر کرنے کے لئے اور دودھ کے لئے مشکیزہ بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے (لیکن دوسرے معنی میں اصل ہے اور پہلے معنی دوسرے معنی سے مستعار لئے گئے ہیں)۔

# لفظ کے مشترک ہونے کی وجوہات

لفظ کے مشترک ہونے کی چند وجوہات ہیں جو ذیل میں بیان کی جاتی ہیں - ایک لفظ دو مختلف لغات میں استعمال ہو جیسے لفظ "صَقْر" اکثر اہلِ عرب اس دودھ کے لئے استعمال کرتے ہیں جو بہت کھٹا ہو جاتے جبکہ اکثر اہلِ مدینہ اس کو انگور کے شہد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

مشترک لفظ کے ایک معنی اصلی ہوں اور دوسرے معنی منقول یا مستعار ہوں۔ منقول و مستعار کے درمیان فرق یہ ہے کہ منقول یہ ہے کہ کسی خاص پیشے یا ہنر والے لوگ ایک لفظ کو اس کے اصلی معنی سے ہٹا کر جس میں اس کا پہلے سے استعمال چلا آ رہا ہے دوسرے معنی میں استعمال کرنے لگیں اور یہ معنی اسی جماعت میں مشہور رہوں، تب وہ لفظ دو معنی میں مشترک ہو جائے گا۔ اسی اصول پر شرعی الفاظ جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ اور وہ خاص الفاظ ہیں جنہیں فقہاء، متکلمین اور علماءِ نحو استعمال کرتے ہیں۔

مستعار یہ ہے کہ ایک لفظ ایک معنی کے لئے موضوع ہے، آپ دوسرے معنی کے لئے کسی مناسبت کی وجہ سے اس لفظ کو مستعار یعنی اُدھار لیں حالانکہ اس دوسرے معنی کے لئے مستقل لفظ موضوع ہے۔ جیسے بہادر کو شیر اور بے وقوف کو گدھا کہنا۔ منقول اور مستعار کے حکم میں فرق یہ ہے کہ منقول کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ لفظ اسی پیشے یا ہنر والے لوگوں میں محدود ہو جبکہ مستعار کے لئے یہ شرط نہیں ہے بلکہ ہر شخص ایک لفظ کو دوسرے معنی کے لئے مستعار لے سکتا ہے بشرطیکہ دونوں معنوں میں کوئی تشبیہ اور مناسبت ہو۔ مثلاً آپ کہیں کہ "رَکِبْتُ بَرْقًا" یعنی میں بجلی پر سوار ہوا اور آپ کی یہ مراد ہو کہ میں ایسے گھوڑے (یا گاڑی) پر سوار ہوا

جو تیزی میں بجلی کی طرح ہے یا مثلاً " رَأَیْتُ بَحْرًا " یعنی میں نے سمندر دیکھا یعنی ایسا سخی دیکھا جو سمندر کی طرح سخاوت کرتا ہے۔

مشتق کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ مشتق منہ کے ساتھ اس کے حروفِ اصلیہ میں شریک ہو اور مشتق منہ کے کچھ معنی مشتق میں پائے جائیں لیکن وہ حروف یا حرکات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ حرکات میں اختلاف جیسے " ضَرْبٌ " مشتق منہ اور " ضَرَبَ " مشتق۔ یا مشتق کے حروف مشتق منہ کے حروف سے زائد ہوں جیسے " ضَرْبٌ " مشتق منہ اور " ضَارِبٌ " و " اِسْتَضْرَبَ " مشتق یا مشتق کی مشتق منہ کے ساتھ حروفِ اصلیہ میں شرکت تقدیرًا ہو، ظاہر میں نہ ہو جیسے لفظ " مُخْتَارٌ " فاعل ہو یا مفعول اپنے مشتق منہ " اِخْتِیَارٌ " کے حروف اصلی میں تقدیرًا شریک ہے۔ کیونکہ بظاہر مشتق منہ میں ی بھی ہے جبکہ مشتق " مختار " میں ی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مزید مثالیں بھی ہیں جو سابقہ بحث میں بیان کی گئی ہیں۔

مذکورہ بحث سے مفرد الفاظ کی انواع اور ان میں اشتباہ واقع ہونے کی وجہ واضح ہو گئی۔

مرکّب لفظ وہ ہے جو مفرد کی تین اقسام اسم، فعل اور حرف سے مرکب ہو۔ ترکیب کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ ایسی ترکیب جس سے مفید جملہ حاصل ہو۔ یہ یا تو دو اسموں سے یا ایک اسم اور ایک فعل سے ظاہر میں یا تقدیری صورت میں مرکب ہو گی۔

۲۔ ایسی ترکیب جس سے مفید جملہ حاصل نہ ہو۔ اس کی مختلف اقسام ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یا دو اسموں کو مرکّب کر کے ایک اسم بنا لیا جائے جیسے خَمْسَةَ عَشَرَ اور بَعْلَبَكَّ۔ یا ایک اسم دوسرے اسم کی طرف مضاف ہو جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ یا اسم و فعل سے مرکب ہو جیسے تَأَبَّطَ شَرًّا (تَأَبَّطَ فعل اور شَرًّا اسم ہے)۔

یا اسم و حرف سے مرکب ہو جیسے سِیْبَوَیْہ (سِیْب" اسم اور "وَیْہ" حرف ہے)، یا فعل و حرف سے مرکب ہو جیسے ھَلُمَّ، یا دو حروف سے مرکب ہو جیسے "اِنَّمَا"، یا ایک کلام کے اختصار سے مرکب ہو اس طرح کہ جملہ کے بعض اجزاء کو حذف کر دیا جائے جیسے بِسْمِ اللّٰہِ کے لئے "بَسْمَلَۃ"، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ کے لئے "حَیْعَلَۃ"، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کے لئے "حَوْقَلَۃ"۔

مرکب کلام میں مندرجہ ذیل وجوہ سے شبہہ واقع ہو سکتا ہے:۔

کلام کے مفرد کلمات کی وجہ سے شبہہ واقع ہو۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اگر مفرد کلمات کی وجہ سے شبہ نہ ہو تب یا تو مرکب کلام کے معنی کی وجہ سے یا لفظ کی وجہ سے شبہ ہو گا۔

معنی کی وجہ سے اگر شبہ ہو تو وہ اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ عبارت میں تبدیلی کی جائے۔ اس لئے کہ معنی کی دو قسمیں ہیں۔ واضح اور غیر واضح۔

واضح معنی وہ ہیں جو تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آجائیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

| | |
|---|---|
| وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (النساء: ۳۶) | اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ |

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

| | |
|---|---|
| قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا۔ اِلٰی قولہ۔ ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام: ۱۵۱ تا ۱۵۳) | آپ فرما دیجیے کہ آؤ میں تلاوت کروں ان چیزوں کی جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (آخر آیت تک) ان مذکورہ |

امور کے ساتھ اس نے تم کو وصیت کی ہے تاکہ

تم پرہیزگار بن جاؤ۔

غیر واضح معنی کی تین قسمیں ہیں :۔

اوّل :۔ معنی فی نفسہ پوشیدہ ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں اور اس کی ذات اقدس کو کسی چیز سے تشبیہ دینے سے ممانعت کے بارے میں جو کلام ہے۔

دوم :۔ کلام ایک اصول ہو جو چند فروعات پر مشتمل ہو جیسے احکام پر دلالت کرنے والی آیات۔

سوم :۔ کلام ایک ضرب المثل و اشارہ ہو۔ جیسے عربوں کا یہ قول ہے کہ " اَلصَّیْفَ ضَیَّعْتَ اللَّبَنَ " یعنی گرمی میں تو نے دودھ کو ضائع کر دیا۔ ایسے کلام کا ظاہر ایک چیز کی خبر دیتا ہے لیکن حقیقت میں مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔ اس قسم کا کلام قرآن کریم میں موسیٰ علیہ السلام و خضر علیہ السلام کا قصّہ ہے کہ جس میں کشتی کو توڑنے، ایک بے گناہ جان کو قتل کرنے اور کسی ظاہری فائدہ کے بغیر دیوار کو سیدھا کرنے کا بیان ہے۔ اور جیسے باہم جھگڑنے والے ان دو فریقوں کا قصّہ جو حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اچانک آدھمکے تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام ان سے ڈر گئے تھے۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ کلام :۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (النمل:۸۲) | اور جب ان پر قول واقع ہو گا ہم ان کے لئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے بات کرے گا۔ |

لفظ کی بھی دو قسمیں ہیں :۔

واضح لفظ :۔ الفاظ کی تعداد اور ان کی ترکیب اصول کے مطابق ہو جیسے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الفاتحہ:۱) تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں

کو پالنے والا ہے۔

**غیر واضح لفظ:۔** اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔

**ترکیب کی وجہ سے :۔** جس لفظ کو مؤخر کرنا چاہیئے اسے مقدّم کر دیا جائے یا جسے مقدّم کرنا چاہیئے اسے مؤخر کر دیا جائے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

وَمَا مِثْلُهُ فِی النَّاسِ اِلَّا مُمَلَّکًا  اَبُوْ اُمِّهٖ حَیٌّ اَبُوْہُ یُقَارِبُہٗ

"لوگوں میں اُس (ممدوح یعنی ابراھیم بن اسمٰعیل) کے رشتہ داروں میں سے اس کے مثل کوئی زندہ نہیں ہے مگر خلیفہ (یعنی ہشام بن عبد الملک) کہ خلیفہ کی ماں کا باپ اس ممدوح کا باپ ہے (یعنی ممدوح خلیفہ کا ماموں ہے)"۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں اَبُوْ اُمِّہٖ مبتدا اور اَبُوْہُ خبر ہے جسے مؤخر کر دیا اور حَیٌّ موصوف یُقَارِبُہٗ اس کی صفت، اسے بھی موصوف سے مؤخر کر دیا اور موصوف صفت مثلہ مبتدأ کی خبر ہے۔

اسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِیْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ لِیُدْخِلَ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ لَوْ تَزَیَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ (الفتح: ۲۵)

اور اگر (مکّہ میں) بہت سے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جو تم کو معلوم نہیں یعنی یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم ان کو پیس ڈالتے پھر تم پر ان کی وجہ سے خرابی پڑتی بے خبری سے، تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے تو ہم کافروں کو عذاب دیتے۔

الفاظ کی تعداد کے اعتبار سے غیر واضح کلام یا تو اس لئے ہوگا کہ کلام میں مقصود سے زیادہ الفاظ ہوں گے یا حذف و اختصار ہوگا۔ زیادہ الفاظ ہونے کی مثال جیسے

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ (البقرۃ : ۱۷۱)

اور ان کافروں کی مثال ایسی ہے جیسے پکارے کوئی شخص۔

(اس آیت میں ''ک'' اور ''مَثَلَ'' دونوں جمع ہیں حالانکہ دونوں کے معنی ایک ہیں)۔

اور جیسے اللہ کا یہ فرمان:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْمَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ (الروم : ۲۸)

اللہ تم کو ایک مثال خود تمہارے حالات سے بیان کرتا ہے۔ کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی شخص تمہارے اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں (کہ) تم ان کی ایسی ہی پرواہ کرتے ہو جیسی اپنوں کی کرتے ہو۔

حذف واختصار کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:۔

وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ

(البقرۃ : ۱۷۸)

اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔

ایک کی دوسرے کی طرف نسبت کی وجہ سے کلام کا غیر واضح ہونا۔ یہ مخاطب کے حال کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ جیسے آپ کا یہ کہنا اِفْعَلْ یعنی کام کر۔ اب یہ کلام طلب وسفارش ہو سکتا ہے اگر مخاطب عمر میں بڑا ہو، اور حکم ہو سکتا ہے اگر مخاطب چھوٹا ہو۔

## وہ اسباب جو متکلّم کی مراد سمجھنے میں مانع ہوتے ہیں

یہ اسباب تین ہیں:۔

**پہلا سبب**:۔ خطاب سے متعلّق ہے ۔اس کی تفصیل پہلے گزر چکی کہ لفظ یا معنیٰ غیر واضح ہوں۔

**دوسرا سبب**:۔ متکلم سے متعلّق ہے کہ متکلم مافی الضمیر کو بیان نہ کر سکے یا مافی الضمیر کو ادا کرنے میں اس کی عبارت و بیان قاصر ہو۔ اللہ تعالیٰ کا خطاب اس سبب سے پاک ہے۔

**تیسرا سبب**:۔ مخاطب سے متعلق ہے کہ مخاطب کی سمجھ کمزور ہو یا اس کا دل متکلّم کے کلام سے غافل ہو اور کسی دوسری چیز میں مشغول ہو ۔ قرآن کے مخاطب یعنی انسانوں میں بعض مخاطب ایسے بھی ہیں لیکن تمام مخاطب ایسے ہو جائیں، یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ بعید بات ہے کہ تمام لوگ قرآن کو نہ سمجھیں۔

## وہ امور جو اختلاف اور کثرتِ شبہ کا سبب بنتے ہیں

یہ امور تین ہیں۔ عالم کا فرض ہے کہ ان امور کی وضاحت کرے اور ان امور کی وجہ سے کلام میں جو خلل واقع ہوتا ہے، اسے دور کرے۔

پہلا امر یہ ہے کہ مشترک الفاظ کی وجہ سے شبہہ واقع ہو۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے ۔

**دوسرا امر**:۔ غور و فکر کرنے والوں کے نظریہ کا اختلاف ہے ۔ جیسے فرقہ جبریہ اور فرقہ قدریہ کی نظر و فکر کا اختلاف ہے۔ فرقہ جبریہ والوں نے انسان سے

صادر ہونے والے افعال میں غور کیا اور ان افعال کی نسبت سبب اول یعنی باری تعالیٰ کی طرف کر دی اور کہا کہ انسانوں کے تمام افعال باری تعالیٰ کی جانب سے صادر ہوتے ہیں اور انسان کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر خدا تعالیٰ نہ ہوتا تو یہ افعال بھی وجود میں نہ آتے۔ فرقہ قدریہ والوں نے غور و فکر کے بعد کہا کہ سب ممکنات ہماری طرف سے ہیں اور سببِ اخیر یعنی انسان ہی اپنے افعال کو صادر کرنے والا ہے، سببِ اوّل یعنی باری تعالیٰ نہیں۔

**تیسرا امر:۔** الفاظ سے معنی مراد لینے اور معنی کو لفظوں میں بیان کرنے میں غور و فکر کرنے والوں کے نظریہ کا اختلاف۔ مثلاً علّامہ خطابی کا نظریہ ہے کہ الفاظ جن ذوات پر دلالت کرتے ہیں وہ ذوات ان الفاظ سے ثابت ہوتی ہیں لیکن فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ ذوات کے مناسب الفاظ بیان کئے جائیں (دراصل یہ اختلاف باری تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات و صفات ثابت ہیں۔ قرآن میں اس کے متعلق الفاظ بھی وارد ہیں۔ اب یہ اختلاف ہے کہ ان الفاظ سے وہی معنی مراد لئے جائیں جن پر یہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں یا وہ معنی مراد لئے جائیں جو باری تعالیٰ کے اور اس کی توحید کے مناسب ہیں اور پھر الفاظ میں تاویل کی جائے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق فرقے بن گئے۔ مصنّف نے اسی کے متعلق دوسری مثال یہ دی کہ) جیسا کہ باری تعالیٰ کی صفات کے بارے میں کلام ہے۔ جس کا نظریہ یہ ہے کہ الفاظ سے معانی اسی طرح ثابت ہوتے ہیں جس طرح وہ الفاظ دلالت کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے فرمان:۔

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ (المائدہ: ۶۴) — بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔

اور تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا (القمر: ۱۴) — (وہ کشتی) ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی۔

اور ان جیسی دیگر آیات کی بابت بڑا اشبہہ واقع ہوتا ہے۔

اہل حقائق نے جب یہ بات دلائل سے واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ کثرت سے پاک ہے تو اعضاء اس کے لئے کیسے ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس قسم کے الفاظ کی تاویل کی اور اسے مجاز پر محمول کیا۔ اور اوّل الذکر فرقہ جبریہ جس شبہہ میں پڑ گیا تھا اس سے وہ محفوظ ہو گئے۔

# قرآن کریم میں انواعِ کلام

یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مرکّب کلام کی انواع یہ ہیں:۔ خبر دینا، خبر حاصل کرنا، امر، نہی، طلب اور شفاعت۔ ان انواع میں سے اللہ تعالیٰ کے کلام میں صرف خبر دینا، امر اور نہی ہے۔ اس لئے کہ باری تعالیٰ جو کہ علام الغیوب ہے اسے خبر حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ جو قرآن کریم میں آئے ہیں وہ یا تو کسی واقعہ کو نقل کرتے ہوئے یا بطور انکار اور ڈانٹ ڈپٹ کے آئے ہیں طلب و سفارش کے الفاظ اس لئے نہیں آئے کہ آقا اپنے غلام سے نہ کوئی چیز طلب کرتا ہے اور نہ اس سے سفارش کرتا ہے۔ اس لئے خبر حاصل کرنا، طلب اور شفاعت (یا سفارش) قرآن میں نہیں ہے۔

خبر اسے کہتے ہیں جسے سچا اور جھوٹا کہہ سکیں اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ تین زمانوں (ماضی، حال و مستقبل) میں سے کسی ایک زمانہ سے متعلّق ہوتی ہے۔

امر اور نہی کو سچا اور جھوٹا نہیں کہہ سکتے اور یہ صرف مستقبل سے متعلّق ہوتے ہیں۔

خبر کے دو فائدے ہیں:۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ مخاطب کو جس چیز کا علم نہیں ہے اس چیز کو اس کے سامنے بیان کرنا تاکہ مخاطب کو اس کا علم ہو جائے جیسے

قرآن کریم میں امورِ آخرت، ثواب وسزا سے متعلق کلام ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مخاطب کو جس چیز کا علم ہے اسی کو بیان کرنا تاکہ علم مضبوط و مؤکد ہوجائے۔ جن چیزوں کا علم عقل سے ہوسکتا ہے ان تمام چیزوں کا بیان قرآن میں اسی فائدہ کے طور پر ہے جیسے

اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (سورۃ الاخلاص) — اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔

امر و نہی کے بھی دو فائدے ہیں:۔

پہلا فائدہ:۔ محمود (اچھی) چیز کو حاصل کرنے اور مذموم (بُری) چیز سے بچنے پر مخاطب کو اُبھارنا۔

دوسرا فائدہ:۔ مخاطب کو اس طرح ابھارنا کہ جس چیز کو وہ محمود سمجھتا ہے اسے حاصل کرے اور جس چیز کو مذموم سمجھتا ہے اس سے بچے۔

خبر کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مخاطب کے سامنے حق و باطل کا فرق بیان کردینا تاکہ وہ حق کا اعتقاد کرے نہ کہ باطل کا۔

امر و نہی کا بڑا مقصد یہ ہے کہ جمیل (اچھے) اور قبیح (بُرے) کے درمیان فرق ہوجائے تاکہ مخاطب جمیل (اچھے کام) کے لئے کوشش کرے اور قبیح سے اجتناب کرے۔

ہر خبر یا تو ایسے امر کو بیان کرے گی جس کا عقیدہ رکھنا لازم ہے۔ اسی خبر کا نام خبرِ اعتقادی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النساء: ۱۳۶) — اور جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرے۔

یا وہ ایسے امر کو بیان کرے گی جس سے عبرت حاصل کی جائے تو اس کا نام خبر اعتباری ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام، ان کی امتوں، گزرا ہوا زمانہ اور آسمان و زمین کی پیدائش سے متعلق قرآن کی خبریں ہیں۔

ہر امر و نہی یا تو ایسی چیز کا امر ہو گا جس کے اچھا ہونے کا عقل تقاضا کرے اور ایسی چیز سے نہی (ممانعت) ہو گی جس کو عقل قبیح قرار دے۔ انہیں عقلی اوامر و نواہی کہتے ہیں۔

اور یا ایسی چیز کا امر ہو گا جس کی اچھائی کو ہماری عقلیں معلوم نہیں کر سکتیں اور ایسی چیز سے نہی ہو گی جس کی قباحت و برائی کا ہماری عقلیں ادراک نہیں کر سکتیں۔ انہیں شرعی اوامر و نواہی کہتے ہیں۔

عقلی و شرعی کے درمیان یہ فرق بھی ہے کہ عقلی امر و نہی میں زمانہ گزرنے کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور کسی بھی زمانہ میں وہ منسوخ نہیں ہوتا جبکہ شرعی امر و نہی میں کسی امر کی افادیت کے مطابق تبدیلی و نسخ واقع ہوتا ہے۔

## قرآن کریم کے واضح اور بیان ہونے کی کیفیت

بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ قرآن کی صفت بیان آئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ — یہ لوگوں کے لئے بیان ہے۔

(آل عمران: ۱۳۸)

اور فرمایا: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا — اللہ تمہارے لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔

(النساء: ۱۷۶)

نیز فرمایا: بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ — وضاحت کرنے والی عربی زبان میں ہے۔

(الشعراء: ۱۹۵)

فرمایا: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ (النور: ۳۴) — اور بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف واضح آیات نازل کی ہیں۔

حالانکہ قرآن کریم کی بہت سی آیات مشکل اور متشابہہ ہیں اور بعض آیات اشاروں پر مبنی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (البقرۃ: ۱۰۲) — اور بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر جو کچھ نازل کیا گیا۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (الانبیاء: ۹۶) — یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر اونچائی سے پھسلتے چلے آئیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض آیات کی صفت متشابہہ بیان کی اور فرمایا کہ ان کا مطلب صرف وہی جانتا ہے۔ اس لئے قرآن بیان کس طرح ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا بیان ہونا مطلق نہیں ہے بلکہ مشروط ہے یعنی نمایاں اور ممتاز اہلِ کتاب (قاریٔ قرآن) کے لئے قرآن بیان ہے نہ کہ زمین پر چلنے والے انسانوں میں سے جو بھی اس کو سنے اس کے لئے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے لئے قرآن مجید بیان نہیں ہے۔ پھر عرب بھی قرآن کے جاننے اور سمجھنے میں مختلف درجے رکھتے ہیں۔ اگر بیان ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر عام آدمی اسے سمجھ سکے تو بازاری اور عام انسانوں کا کلام بھی بیان ہو جائے گا یا یہ کہ کسی طرح بھی بیان نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ہر ایک کلام ایک قوم یا طبقہ کے لئے بیان ہے تو دوسری قوم (یا طبقہ) کے لئے بیان نہیں ہے۔

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ۔ (الانفال: ۵۷)

سو اگر کبھی آپ پائیں ان کو لڑائی میں تو ان کو ایسی سزا دیجئے کہ دیکھ کر بھاگ جائیں ان کے پیچھلے۔

اور اس کا فرمان:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ (الانفال: ۵۸)

اور اگر آپ کو کسی قوم سے دغا کا اندیشہ ہو تو ان کا معاہدہ ان کی طرف اس طرح پر پھینک دو کہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔

یہ بہترین کلام ہے لیکن جس شخص کو بلاغت کا ذوق نصیب نہیں ہے اور اس فن کو نہیں جانتا وہ اس آیت کے معانی وخصوصیات کو کیا جانے گا؟ اس کے نزدیک تو یہ کلام دوسرے کلاموں کی طرح ہوگا۔

اسی طرح شاعر کا یہ قول:

فَاقْطَعْ لُبَانَةَ مَنْ تَعَرَّضَ وَصْلُهُ

اس کی خواہش و آرزو ختم کر دے جس کا ملنا ممکن نہ رہے۔

اسی طرح دوسرے شاعر امرؤ القیس کا یہ شعر:

وَمَا الْمَرْءُ مَا دَامَتْ حُشَاشَةُ نَفْسِهِ بِمُدْرِكِ اَطْرَافِ الْخُطُوْبِ وَلَا آلِ

(انسان میں زندگی کی رمق خواہ کتنے ہی عرصہ باقی رہے اور وہ کتنی بھی لمبی عمر پائے وہ اپنی تمام آرزوؤں کو حاصل نہیں کر سکتا، لیکن ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں وہ آخری سانس تک کوئی دقیقہ بھی اُٹھا نہیں رکھتا)۔

یہ دونوں اقوال فصیح کلام ہیں لیکن تمام لوگ ان کی فصاحت نہیں جانتے۔ قرآن اگرچہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن اسے جاننے اور اس کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنے میں سب برابر نہیں ہیں بلکہ ہر شخص اپنے مرتبہ، حال اور علم کے مطابق

اس کا احاطہ کرتا ہے۔

پس فصاحت و بلاغت کے ماہر قرآن کی فصاحت کو، فقہاء اس کے احکام کو، متکلمین اس کے عقلی دلائل کو اور مفسرین اس کے قصوں کو خاص طور پر سمجھتے ہیں۔ ایک فن کا ماہر جن چیزوں کو سمجھ لیتا ہے دوسرے فن کا ماہر ان چیزوں سے لاعلم رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر انسان کی اپنی حاصل کردہ علمی قوت کے بقدر قرآن کے گہرے معانی کی معرفت کا اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح احادیث کا حال ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے علم کے مطابق انہیں سمجھتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا كَمَا سَمِعَهَا حَتّٰى يُؤَدِّيَهَا اِلٰى مَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ

(مسند احمد وسنن ابی داؤد وسنن ابن ماجۃ بالفاظ مختلفۃ)

اللہ تعالیٰ تر و تازہ رکھے اس شخص کو جو میری بات سنے اور اسے اسی طرح یاد رکھے جس طرح سُنا ہے یہاں تک کہ وہ بات اس شخص تک پہنچا دے جس نے اس کو نہیں سنا کیونکہ بہت سے وہ افراد جن تک بات پہنچائی جائے وہ اس کے اصل سننے والوں سے زیادہ محفوظ کرنے والے ہوتے ہیں۔

---

## تفسیر و تاویل میں فرق

فَسَرَ اور سَفَرَ دو مختلف الفاظ ہیں لیکن جس طرح یہ لفظوں میں ایک دوسرے کے قریب ہیں اسی طرح معنی میں بھی قریب قریب ہیں۔ یعنی ظاہر کرنا۔ لیکن فَسَرَ

معقول معنی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے لفظ تَفْسِرَۃ بنا ہے یعنی وہ شیشی (قارورہ) جس میں پیشاب بھر کر طبیب کو معائنہ کے لئے دکھاتے ہیں اور یہی نام پانی کے برتن کا رکھا گیا ہے۔ جبکہ سفر محسوس و مشاہد چیزوں کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جیسے کہا جاتا ہے سَفَرَتِ الْمَرْاَۃُ عَنْ وَجْهِهَا (یعنی عورت نے اپنا چہرہ ظاہر کیا)۔ اور اَسْفَرَ الصُّبْحُ (یعنی صبح ظاہر ہو گئی)۔ اور سَفَرْتُ الْبَیْتَ یعنی میں نے گھر کو صاف کیا (ظاہر کیا)۔

لفظ تاویل اٰل یَؤُوْلُ سے نکلا ہے بمعنی واپس لوٹنا۔ لفظ تفسیر لفظ تاویل سے زیادہ عام ہے۔ تفسیر کا اکثر استعمال الفاظ کی وضاحت کے لئے ہوتا ہے جب کہ تاویل کا اکثر استعمال معانی کی وضاحت کے لئے ہوتا ہے جیسے خواب کی تعبیر کو تاویل کہتے ہیں۔ نیز تاویل کا اکثر استعمال صرف آسمانی کتابوں کی وضاحت کے لئے ہوتا ہے جبکہ تفسیر آسمانی و غیر آسمانی دونوں قسم کی کتابوں کی وضاحت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر اور تاویل میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ تفسیر مفرد الفاظ کی وضاحت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور تاویل اکثر جملوں کی وضاحت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

پس لفظ تفسیر یا تو اجنبی الفاظ کی وضاحت کے لئے استعمال ہو گا جیسے لفظ بَحِیْرَۃٌ سَائِبَۃٌ، وَصِیْلَۃٌ کے لئے یا کسی مختصر کلام کی وضاحت کے لئے جیسے

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ — اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

(البقرۃ : ۴۸)

یا کسی ایسے کلام کی وضاحت کے لئے جو کسی قصہ پر مشتمل ہو اور اس قصہ کو بیان کئے بغیر اس کلام کا سمجھنا ممکن نہ ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان :

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ — یہ جو مہینہ کا ہٹا دینا ہے (یعنی کبیسہ یا دَند کا مہینہ) سو وہ کفر کے عہد کی ایک بڑھائی

(التوبۃ : ۳۷)

ہوئی بات ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (البقرۃ: ١٨٩) | اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ۔ |

لفظ تاویل کا استعمال کبھی تو عام ہوتا ہے اور کبھی خاص جیسے لفظ "الکفر" کبھی مطلق انکار کے معنی میں اور کبھی خاص کر باری تعالیٰ کے انکار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ "الایمان" کبھی مطلق تصدیق کے معنی میں اور کبھی دینِ حق کی تصدیق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مشترک لفظ کے معانی میں سے کسی ایک معنی کا تعیّن کرنے کو بھی تاویل کہتے ہیں۔ جیسے لفظ "وجد" موجود، عشق وشوق اور پا نا کے معنی میں مشترک ہے۔ (ان میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کو تاویل کہیں گے)۔

تاویل کی دو قسمیں ہیں:۔ مستنکرہ (ناپسندیدہ) اور منقاد (مناسب، پسندیدہ)۔

مستنکرہ تاویل یہ ہے کہ جب دلیل سے اس کو جانچا جائے تو وہ ناگوار معلوم ہو۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔

اوّل:۔ لفظ عام میں تخصیص کر کے اس کے بعض افراد مراد لئے جائیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

| | |
|---|---|
| وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (التحریم: ٤) | اور اگر تم دونوں (بیبیاں) اس (نبیؐ) پر غالب آنے کی کوشش کرو گی تو اللہ اس کا رفیق ہے اور جبریل اور نیک کردار ایمان والے۔ |

اس آیت میں بعض افراد نے "صالح المؤمنین" سے صرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مراد لئے ہیں۔

دوم :۔ دو آیتوں کو ملا کر ان سے ایک مطلب نکالنا۔ جیسے کسی نے یہ گمان کیا کہ تمام جانور بھی مکلّف ہیں، اور دلیل یہ دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر : ۲۴)
اور کوئی امّت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا (نبی) نہ گزرا ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَآئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (الانعام : ۳۸)
اور زمین پر کوئی چلنے والا (جانور) یا اپنے دونوں بازوؤں سے اُڑنے والا پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری طرح امّت نہ ہو (وہ بھی تمہاری طرح امتیں ہیں)۔

تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان "اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ" اس پر دلالت کرتا ہے کہ جانور بھی ہماری طرح مکلّف ہیں۔

سوم :۔ جھوٹی خبر یا جھوٹی روایت کے مشابہ خبر سے تاویل کی جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (القلم : ۴۲)
جس دن کہ پنڈلی کھول دی جائے گی۔

بعض نے کہا کہ اس آیت میں ساق سے بدن کا عضو پنڈلی مراد ہے اور ایک موضوع حدیث سے استدلال کیا[1]

[1] اور کہا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھول دے گا۔ حالانکہ یہاں یہ عربی محاورہ استعمال ہوا ہے جس سے کسی واقعہ کی ہولناکی کا اظہار مقصود ہوتا ہے اور یہاں یہ قیامت کی ہولناکی کی شدت بیان کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔

چہارم :۔ بعید (یعنی دور از کار) استعارات اور اشتقاق کے ذریعہ تاویل کی جائے۔ جیساکہ بعض لوگوں نے کہاکہ سورۃ البقرۃ میں "بقر" سے مراد انسان ہے اور اسے بقر اس لئے کہاکہ وہ علوم کے راز پھاڑتا تھا یعنی کھولتا تھا نیز قرآن میں مذکور "ھُدْھُد" کے بارے میں کہاکہ اس سے مراد بھی انسان ہے اور اسے خوب بحث و تفتیش کی بناء پر ہُدہُد کہاکیونکہ ہُدہُد میں بھی یہ صفات ہوتی ہیں۔

پہلی قسم کی تاویل وہ بناوٹی فقیہہ کرتے ہیں جنہیں خاص و عام کی کما حقہ معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری قسم کی تاویل اکثر وہ متکلم کرتا ہے جو الفاظ کی شرائط کی معرفت میں کمزور ہوتا ہے۔ تیسری قسم کی تاویل وہ محدّث کرتا ہے جو قبول روایت کی شرائط کی رعایت و لحاظ نہیں کرتا۔ چوتھی قسم کی تاویل وہ ادیب کرتا ہے جو استعارہ اور اشتقاق کی شرائط کا لحاظ نہیں کرتا۔

منقاد تاویل وہ ہے جس میں مذکورہ ناگواری نہ ہو۔ اس تاویل میں بھی علم میں راسخ و ماہر افراد کے درمیان تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے اختلاف ہوتا ہے۔ یا تو مشترک لفظ کی وجہ سے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (الانعام : ۱۰۳) نگاہیں اس کا یعنی اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتیں۔

اس میں اختلاف ہے کہ یہاں ابصار (نگاہوں) سے ظاہری آنکھ مراد ہے یا دل کی آنکھ۔

اور یا کلام کی ترکیب کی وجہ سے اختلاف ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا (النور : ۴، ۵) اور وہ لوگ فاسق ہیں مگر وہ جنہوں نے توبہ کی۔

اس آیت میں یہ اختلاف ہے کہ استثناء صرف معطوف سے ہے یا معطوف و معطوف علیہ دونوں سے ہے۔

اور یا معنیٰ کے غیر واضح اور لفظ کے مختصر ہونے کی وجہ سے اختلاف ہوتا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرۃ: ۲۲۷)

اور اگر انہوں نے بالکل چھوڑ دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

ان معتبر وجوہ میں فیصلہ کرنے کے لئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کا کلام کس صورت میں ہے۔ اگر امر و نہی کی صورت میں ہے تو پھر عقلی امر و نہی ہونے کی صورت میں اس کے معنیٰ کھولنے کے لئے دلائلِ عقلیہ کی طرف متوجہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی ترغیب دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (ص: ۲۹)

یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس لئے نازل کیا تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہلِ فہم نصیحت حاصل کریں۔

اگر شرعی امر و نہی ہے تو اس کے معنیٰ واضح کرنے کے لئے محکم آیت یا واضح سنّت کی طرف متوجہ ہو۔ اگر اعتقادی خبر ہے تو دلائلِ عقلیہ کی طرف متوجہ ہو، اور اگر اعتباری خبر ہے تو قصّوں میں بیان کی ہوئی واضح صحیح روایات کی طرف متوجہ ہو۔

# ایک ہی مطلب و معنی کو بیان کرنے کے مختلف طریقے

ایک ہی قسم کے معنی مختلف عبارتوں سے سمجھ میں آتے ہیں اور عبارتوں کا اختلاف مقاصد کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان طریقوں کو بیان کیا جائے کہ جن سے ایک معنی کے لئے مختلف عبارتیں ہو جاتی ہیں۔

ایک معنی پر مختلف اشیاء کے ذریعہ دلالت کی جاتی ہے مثلاً یا تو اس کے تمام

کے ذریعہ جیسے "انسان" یا اس کی نسبت کے ذریعہ جیسے "آدمی" اور "حوا"، یا اس کی کسی ایک لازمی خصوصیت کے ذریعہ جیسے "سیدھی قامت والا" یا اپنے دو پاؤں پر چلنے والا یا "چوڑے ناخن والا" یا اس کے لازمی امتیاز کے ذریعہ جیسے "ناطق" "مائیہ"۔ نیز جیسا کہ ایک چیز کو بہت سی صفات کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے اسی طرح بہت سے اسماء کے ذریعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جو کہ مختلف اوصاف کو شامل ہوتے ہیں۔ جیسے عرب بلند جسم کو "السماء" یعنی آسمان کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کی بنسبت بلند ہے اور "جربا ء" یعنی کھجلی والا "ستاروں بھرے آسمان کو کیونکہ آسمان میں ستارے ایسے ہی متفرق جگہ ہیں جیسے انسانی جسم میں خارش و پھنسی، اور خارش کو عربی میں "جرب" کہتے ہیں۔ اسی طرح آسمان کو "خَلْقَاء" اور "مَلْسَاء" بمعنی چکنا کہتے ہیں، کیونکہ دن کے وقت ستارے غائب ہوجاتے ہیں تو آسمان چکنا معلوم ہوتا ہے۔ اور "رَقْعَاء" بمعنی "پیوند زدہ" کہتے ہیں، کیونکہ آسمان میں ستارے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کپڑے میں پیوند کے ٹکڑے۔ اور آسمان کے رنگ کا اعتبار کرتے ہوئے خضراء کہتے ہیں (جیسے اُردو میں "نیلی چھتری" یا "نیلا گنبد")۔

اسی طرح عرب عورت کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ مثلاً "زَوْج" کیونکہ وہ آدمی سے مل جاتی ہے اور جوڑا بن جاتا ہے۔ "ظَعِيْنَة" بمعنی ہودج کیونکہ عورت ہودج میں بیٹھ کر سفر کرتی ہے۔ "قَعِيْدَة" بمعنی بیٹھی ہوئی، کیونکہ عورت گھر میں بیٹھتی ہے یا یہ کہ مرد کے لئے سواری ہوتی ہے جس طرح سواری کے مخصوص اونٹ کو "قَعُوْد" اور گھوڑے کو "قُعْدَة" کہتے ہیں۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ شاعر نے بھی عورت کو مَطِيَّة کہا ہے ؎

؎ مَطِيَّاتُ السُّرُوْرِ فُوَيْقَ عَشْرٍ　　　إِلَى عِشْرِيْنَ ثُمَّ قِفِ الْمَطَايَا

(خوشی کی سواریاں (یعنی عورتیں) دس سے اوپر بیس تک ہیں۔ پھر سواریوں کو کھڑا کردو)۔

"حَلِیۡلَۃ"، کیونکہ عورت مرد کے ساتھ ایک منزل میں رہتی ہے اور حلول کے معنی بھی منزل میں اترنا ہے یا اس لئے کہ وہ مرد کے لئے ازار (شلوار) کھولتی ہے اور حلّ کے معنی کھولنا ہیں۔

یہ عمل دو امر میں سے کسی ایک امر کی وجہ سے کیا جاتا ہے:

یا تو اس وجہ سے کہ ایک چیز کو اس کی صفات ہی کے ذریعہ ظاہر کرنا ممکن ہے تو ایسی عبارت لائی جاتی ہے جو اس کی صفات پر دلالت کرے جیسے باری تعالیٰ کی ذات کی معرفت ہمارے لئے مشکل ہے، ہم اسے اس کی صفات ہی کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اپنی صفات بیان کی ہیں تاکہ ہم اس ذات اقدس کو ان صفات سے متصف کریں اور یہ صفات اس کی معرفت کا ذریعہ بن جائیں۔ اس لئے کہ ہم باری تعالیٰ کو اس کی صفات اور اس کے افعال ہی کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء: ۲۳) کیا حقیقت ہے پروردگارِ عالم کی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (الشعراء: ۲۴) کہا وہ پروردگار عالم ہے آسمان اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے (ان سب کا)۔

اور جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا:

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (طٰہٰ: ۴۹) اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی

ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ : ۵۰) صورت دی پھر راہ سمجھائی۔[1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں اللہ تعالیٰ کی ماہیت بیان نہیں کی کیونکہ اس کی ذات اس سے پاک ہے، بلکہ باری تعالیٰ کی کثیر صفات کا حوالہ دیا۔

اور یا اس لئے کہ ایک چیز کے لئے مختلف ترکیبیں اور احوال ہوتے ہیں تو ہر حال کے مناسب و مطابق اس چیز کا نام رکھا جاتا ہے جس طرح آسمان کے ناموں کی تفصیل میں یہ بحث گزر چکی ہے یہی کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سُمِّیتُ مُحَمَّدًا وَاَحْمَدَ وَخَاتِمًا وَحَاشِرًا وَعَاقِبًا وَمَاحِیًا — میرا نام محمد، احمد، خاتم، حاشر، عاقب اور ماحی رکھا گیا ہے۔

(صحیح بخاری، سنن ترمذی، موطا امام مالک۔
لیکن ان تینوں کتابوں میں لفظ "خاتم" نہیں ہے (مترجم)

اس لئے کہ محمدؐ کے معنیٰ جس کی تعریف کی گئی ہو اور آپ کی بھی بہت تعریف کی گئی ہے، احمدؐ کے معنیٰ بہت زیادہ تعریف کرنے والا اور آپ بھی باری تعالیٰ کی بہت زیادہ تعریف کرتے تھے، خاتمؐ کے معنیٰ مُہر اور ختم کرنے والا اور آپ بھی تمام انبیاءؑ کے لئے مُہر ہیں یا نبوت کا سلسلہ ختم کرنے والے ہیں، حاشرؐ کے معنیٰ جمع کرنے والا اور آپ بھی قیامت کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں یعنی آپ کے آنے کے بعد اب قیامت ہی آئے گی۔ آپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ (سبا : ۴۶) — یہ تو تم کو ایک بڑی آفت کے آنے سے ڈرانے والا ہے۔

عاقبؐ کے معنیٰ پیچھے آنے والا اور آپ بھی تمام انبیاءؑ کے پیچھے اور بعد میں آئے ہیں۔ ماحیؐ کے معنیٰ مٹانے والا، اور آپ کی جو اتباع کرتا ہے اس کی برائیاں مٹ

[1] یعنی پیدا کیا اور زندہ رہنے کا طریقہ سکھایا۔ ۱۲

جاتی ہیں۔

# حقیقت و مجاز

لفظ حقیقت لفظ حق سے نکلا ہے اور حق کا استعمال دو۲ طرح ہوتا ہے :۔

پہلا استعمال ان موجودات میں ہوتا ہے جن کا وجود حکمت کے مطابق ہے جیسے یہ قول کہ موت حق ہے، مرنے کے بعد زندہ ہونا حق ہے، آخرت میں حساب حق ہے۔

دوسرا استعمال اس اعتقاد کے لئے ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود کے مطابق ہوتا ہے یا جس حال میں کوئی چیز ہو اس حال کے مطابق قول کو بھی حق کہتے ہیں۔ جیسے یہ کہا جائے کہ "مرنے کے بعد زندہ ہونے میں فلاں کا اعتقاد حق ہے، اور ثواب و عقاب میں اس کا قول حق ہے"۔ حق کی ضد باطل ہے اور حق کی پہچان کے بعد باطل کی بھی پہچان ہو جاتی ہے کیونکہ دو متضاد چیزوں کے بارے میں علم بھی ایک علم کہلاتا ہے۔

حقیقت کا استعمال یہ ہے کہ کبھی معنی کو حقیقت کہتے ہیں اور کبھی لفظ کو حقیقت کہتے ہیں۔

معنی میں حقیقت کے استعمال کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جو حق کے بارے میں خبر دے اور اس پر دلالت کرے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب حضرت حارثہؓ نے کہا کہ "میں نے مؤمن حق ہونے کی حالت میں صبح کی"، تو آپؐ نے فرمایا کہ "ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے"؟ یعنی وہ کیا چیز ہے جو اس حق کی خبر دے اور اس پر دلالت کرے۔ (یعنی اس کی نشانی یا علامت یا دلیل بتاؤ)۔

عمل، اعتقاد اور خبر کے لئے بھی لفظ حقیقت استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس فعل، اعتقاد اور قول کی حقیقت ہے۔ اس حقیقت کے مقابل لفظ "مجاز"

تسمّح اور توسّع" استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس فعل، اعتقاد اور خبر میں مجاز، تسمّح اور توسّع ہے۔ چیز جس حال میں ہے اس کے مطابق خبر کو حقیقت بھی کہہ سکتے ہیں اور مجاز بھی، اس جیسی خبر میں لفظ مجاز اور لفظ حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لفظ کو حقیقت کہنے سے مراد یہ ہے کہ لفظ کو اہلِ لغت نے جن معانی کے لئے وضع کیا ہے انہی معانی میں اس کا استعمال ہو، اس معنی سے دوسرے معنی میں منقول نہ ہو اور نہ اس میں کمی بیشی کی جائے۔ لفظ مجاز اس کے خلاف ہے۔

حقیقت و مجاز دونوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم مفرد الفاظ میں ہے اور دوسری جملوں میں ہے۔ مفرد الفاظ میں مجاز کی مختلف صورتیں ہیں۔ یا تو ایک معنی سے دوسرے معنی میں منقول ہو جیسے کہا جائے کہ فلاں بڑے کھُر والا ہے یعنی اُسکے قدم بڑے ہیں۔ یا لفظوں میں اضافہ ہو جیسے "اُنْظُرْ" کی جگہ "اُنْظُوْر"۔ اور حدیث:

اَرَأَيْتِ لَوْكَانَ عَلٰى اَبِيْكِ دَيْنٌ "فَقَضَيْتِيْهِ" — یعنی اگر تمہارے باپ کے ذمہ قرض ہو اور تم اسے ادا کرو اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔

اس حدیث میں "فَقَضَيْتِيْهِ" کو "قَضَيْتِهِ" کی جگہ استعمال کیا ہے۔

یا لفظوں میں کمی ہو جیسے اس مصرعہ میں

دَرَسَ الْمَنَا بِمُتَالِعٍ فَاَبَانِ — متالع اور ابان پہاڑوں پر گھر مٹ گئے۔

اس مصرعہ میں "اَلْمَنَا" سے مراد "اَلْمَنَازِلُ" ہے[1]۔

بسا اوقات ایک لفظ ایک لحاظ سے حقیقت ہوتا ہے اور دوسرے لحاظ سے مجاز جیسے عرب کا قول "فُلَانٌ عَظِيْمُ الْاَقْدَامِ" (یعنی فلاں بڑے قدموں

---

[1] جیسے فارسی میں خورشید کی جگہ خور کہہ دیتے ہیں۔

والا ہے)۔

اس قول میں واحد لفظ قدم اپنے معنی میں حقیقت ہے اور جمع کے صیغہ میں مجاز ہے۔

جملوں میں مجاز یا تو صرف حذف ---- کے ساتھ ہوگا یا اضافہ کے ساتھ۔

حذف کے ساتھ مجاز کی یہ صورت ہوگی کہ جس کلمہ کو حذف کیا ہے اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ کسی کسی طرح اس پر دلالت ہو رہی ہوگی۔ یہ اختصار کی ایک قسم ہے جیسے مبتدا، یا خبر یا مضاف یا مضاف الیہ یا مفعول یا فاعل کو حذف کرنا۔ اس کی مثالیں اتنی مشہور ہیں کہ انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اضافہ کے ساتھ مجاز کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ لفظوں میں ہر وہ اضافہ جس سے معنی میں اضافہ ہو یا مختصر کی تفصیل ہو یا مبہم کی شرح ہو اس کے مستحسن اور اچھا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے بشرطیکہ اس میں بلاغت کے اصولوں کی رعایت ہو۔ جیسے قرآن کریم میں حضرت جبرائیل علیہ السلام و میکائیل علیہ السلام کا ذکر فرشتوں (ملائکہ) کے ذکر کے بعد اور "نخل" (کھجور) اور "رُمّان" (انار) کا ذکر "فاکھۃ" کے بعد ہوا ہے۔ اسی طرح فعل کے بعد لام کا اضافہ جیسے "شَکَرْتُہٗ" کے بجائے "شَکَرْتُ لَہٗ"۔

وہ اضافہ جو بُرا سمجھا جاتا ہے تو ہر وہ اضافہ ہے جس کا ذکر کرنا اور ذکر نہ کرنا برابر ہو جیسے بعض لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (شوریٰ : ۱۱) اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

اس میں کاف اور

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ جدھر بھی تم رُخ کرو اُدھر اللہ کی ذات ہے۔

(البقرہ : ۱۱۵)

اس میں لفظ "وجہ" اور "بِسْمِ اللّٰہِ" میں لفظ "اسم" اور

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ (اعراف:۱۲) یعنی کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کیا۔

اس آیت میں لفظ "لاَ" زائد ہے۔ لیکن یہ صرف وہم وگمان ہے۔ ہر ایک آیت کی اپنے موقع پر جب ہم تفسیر کریں گے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ حروف زائد نہیں ہیں بلکہ ان کے صحیح معانی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو آیات بطور مثال یا کسی خاص چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ذکر کی ہیں، ان میں بعض لوگوں نے حقیقی معنی مراد لینے کی کوشش کی اور یہ خیال کیا کہ اگر ان آیات کے حقیقی معنی مراد نہیں لیں گے تو جھوٹ ہو جائے گا جیسے یہ آیت:

خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ (صٓ:۲۲) ہم دو جھگڑنے والے ہیں زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول:

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا (الانبیاء:۶۳) نہیں بلکہ یہ ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔

حتیٰ کہ بعض لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَمْ يَكْذِبْ اِلَّا ثَلَاثَ كَذِبَاتٍ كُلُّهَا يُمَاحِلُ بِهَا عَنْ دِيْنِهٖ قَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ وَهٰذِهٖ اُخْتِيْ وَبَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ

بے شک ابراہیمؑ نے بالکل جھوٹ نہیں بولا سوائے تین جھوٹ کے، ہر ایک کے ذریعہ انہوں نے اپنے دین کے دفاع میں جھگڑا کیا۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ "میں بیمار ہوں" اور "یہ میری بہن ہے" اور "بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا"

اس فرمان کو حقیقت پر محمول کیا اور ان پر یہ بات مخفی ہو گئی کہ یہ بطور مثال مذکور ہے، اگر اس میں صحیح توجیہہ کی کوشش کی جائے تو یہ جھوٹ نہیں ہوگا۔ جیسے کسی کو کام

پرا بھارنے کے لئے عربی میں یہ محاورہ ہے کہ "اگر تمہیں کرنا ہی ہے تو کنارے کنارے چلو"۔ اسی طرح جو شخص کسی چیز کو ضائع کر دے تو بطورِ عتاب اس سے یہ محاورہ بولتے ہیں کہ "گرمیوں میں تم نے دودھ ضائع کر دیا"۔

مفسرین کا قول ہے کہ اسی ضرب المثل کی طرح مضمر بھی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ کیونکہ مضمر کے معنی چھپی ہوئی بات، اور یہ وہی کر سکتا ہے جس کا دل ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہے۔ حالانکہ مفسرین نے مضمر سے یہ معنی مراد نہیں لئے، بلکہ یہ مراد لئے ہیں کہ ایک کلام بول کر دوسرے معنی مراد لئے جائیں اور ان کو زبان سے ادا نہ کیا جائے۔

جیسے عرب کا قول ہے اَحَشَفًا وَسُوْءَ کَیْلَۃٍ اس کا ظاہری مطلب ہے کہ کیا ردّی کھجور اور کم تولنا میرے لئے جمع کر رہے ہو۔ حقیقت میں یہ اس شخص کے لئے کہا جاتا ہے جس میں دو بُری عادتیں ہوں۔ (جیسے اُردو میں ہے کریلا اور نیم چڑھا)۔ اِس قسم کی مثالوں سے سامع ان کا حقیقی اور چھپا ہوا مطلب سمجھتا ہے۔

# عام وخاص

اس کی تین قسمیں ہیں :۔

**عام مطلق :** یہ جنس ہے جیسے حیوان، دانے (یعنی جو کثیر افراد پر صادق ہو)۔

**خاص مطلق :** جیسے زید، عمر، یہ آدمی۔

**عام مِنْ وجہٍ وخاص مِنْ وجہٍ :** جیسے انسان کہ یہ حیوان کے مقابلہ میں خاص ہے (کیونکہ حیوان کے افراد زیادہ ہیں) لیکن زید وعمر کے لحاظ سے عام ہے۔

عام کو خاص پر محمول کر سکتے ہیں یعنی خاص کو مبتدا، اور عام کو اس کی خبر بنائیں تو کلام سچا ہوگا۔ جیسے زید انسان ہے یا زید حیوان ہے یا انسان حیوان ہے۔

خاص کو اگر عام پر محمول کریں تو کلام جھوٹا ہوگا جیسے حیوان انسان ہے یا انسان زید

ہے لیکن اگر عام کو مقید کر دیا جائے تو پھر کلام سچا ہو گا جیسے "یہ انسان زید ہے"، یا "انسان زید ہے" کہہ کر یہ مراد لیا جائے کہ کامل انسانیت زید میں ہے۔

یہ بات واضح ہونے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ جب مفسّر کسی عام کی خاص کے ذریعہ تفسیر کرتا ہے یعنی عام پر خاص کو محمول کرتا ہے تو اس کا یہ ارادہ ہوتا ہے کہ عام اس کے بعض افراد کے ساتھ خاص ہے، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عام کے وہی افراد ہیں جو خاص کے افراد ہیں، اس کے علاوہ نہیں۔

جن لوگوں کو برہان و دلائل کے اصول معلوم نہیں اور اس کی مہارت نہیں رکھتے وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک عام دو خاص میں استعمال ہوا ہے یعنی عام کے وہی افراد مراد ہیں جو خاص کے افراد ہیں تو وہ اسے مشترک قرار دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے نظائر قرآن پر کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں ایسے لوگ بہت ہیں، اور انہوں نے کہا کہ اِثم کے معنی گناہ کا ارتکاب اور جھوٹ دونوں ہیں۔ دلیل یہ دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا (الواقعۃ: ۲۵)

وہ نہیں سنیں گے اس (جنت) میں بکواس اور نہ جھوٹی تہمت (گناہ)۔

وہ کہتے ہیں کہ "اس آیت میں اثم سے مراد جھوٹ ہے۔ معلوم ہوا کہ اثم کے دو معنی ہیں: گناہ کا ارتکاب کرنا اور جھوٹ بولنا" حالانکہ اثم سے مراد مطلق گناہ ہے خواہ قولی ہو یا فعلی یعنی اثم کے لفظ میں یہ دونوں گناہ شامل ہیں اور اس آیت میں خاص کر کے صرف قولی گناہ کو بیان کیا ہے، کیونکہ سننا قول کا ہوتا ہے فعل کو سنا نہیں جاتا۔

اسی غلط نظریہ و اصول کی بناء پر لحیانی نے کہا کہ "خوف" کے تین معنی ہیں قتال، قتل اور علم۔ قتال کے معنی میں یہ آیت ہے:

فَاِذَا ذَھَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْکُمْ (احزاب: ۱۹) پھر جب خوف جاتا رہتا ہے تو وہ خوب چڑھ چڑھ کر بولتے ہیں اور آپ پر زبان درازی کرتے ہیں۔

قتل کے معنی میں یہ آیت ہے:

وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ (النساء: ۸۳) اور جب ان کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر (افواہ) پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں۔

اور علم کے معنی میں یہ آیت ہے:

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا (بقرۃ: ۱۸۲) پھر اگر کسی کو وصیت کرنے والے سے جانبداری کا یا گناہ کا اندیشہ ہو۔

(ان کے نزدیک یہاں اندیشہ سے مراد علم ہے)۔

یہ ایسے برے نظریے کا ظہور ہے کہ اسے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خاص کی تفسیر عام کے ساتھ کرنا جائز ہے جبکہ خاص کی جنس کو بیان کرنا مقصود ہو۔ جیسے یہ کہنا کہ گرگٹ ایک کیڑا ہے یا گرگٹ ایک جانور ہے۔

## ان اسباب کا بیان جن کی وجہ سے اسم کو لفظوں میں فاعل قرار دیا جاتا ہے

مخلوق کا ہر فعل جیسے بڑھئی کا کام اور کتابت وغیرہ اپنے وجود کے لئے چند چیزوں کا محتاج ہوتا ہے۔ مثلاً فاعل کا جو اس فعل کو انجام دے جیسے بڑھئی، عنصر (یعنی مادّہ) کا جس سے وہ کام ہو جیسے لکڑی، عمل کا جیسے لکڑی کاٹنا وغیرہ، جگہ اور وقت کا جس میں وہ کام ہو، اوزار (یعنی مشین وغیرہ) کا جس کے ذریعہ وہ کام کیا جائے جیسے آری، نقشہ و خاکہ کا جس کے مطابق کام کیا جائے اور مقصد کا جس کے حصول کے لئے وہ کام کیا جائے۔ نیز فاعل رہنمائی کرنے والے کا محتاج ہوتا ہے جو

اس کی اصلاح کرے۔ مقصد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ قریب اور بعید۔ مقصدِ قریب کی مثال جیسے بڑھئی دروازہ .... بنائے تاکہ اس سے نفع حاصل ہو اور مقصدِ بعید یہ ہے کہ اس دروازہ سے گھر کی حفاظت کی جائے۔ ہر فعل کا ایک سببِ قریب ہوتا ہے اور ایک سببِ بعید۔ ان میں سے ہر ایک کی طرف فعل منسوب ہوتا ہے۔ جیسے اگر زید نے کچھ دیا تو کہتے ہیں کہ مجھے زید نے دیا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ نے مجھے دیا، کیونکہ اللہ ہی نے زید کو اس کام کی توفیق دی۔ بسا اوقات سببِ قریب و سببِ بعید دونوں کو جمع کر دیتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ "اللہ نے اور زید نے مجھے دیا"۔ ایک شاعر کا شعر ہے:

حَبَانَا بِهٖ جَدُّنَا وَالْاِلٰـهُ وَضَرْبٌ لَنَا جَذْمٌ صَارِمٌ

(یہ چیز ہمیں خدا، ہمارے دادا اور ہتھیلی کاٹنے والی لڑائی نے عطا کی ہے)

اس شعر میں سببِ اوّل یعنی اللہ تعالیٰ، سببِ متوسط یعنی دادا اور سببِ آخر یعنی لڑائی کی طرف اس چیز کے دینے کی نسبت کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (الزمر: ۴۲)

اللہ وہ ذات ہے جو جانوں کو ان کی موت کے وقت کھینچ لیتا ہے۔ (وفات دیتا ہے)

اور دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (السجدۃ: ۱۱)

آپ کہہ دیجئے کہ تم کو موت کا وہ فرشتہ وفات دیتا ہے جو تم پر مقرر ہے۔

پہلی آیت میں فعل کی نسبت حکم دینے والے یعنی اللہ کی طرف ہے اور دوسری آیت میں جو (فرشتہ) یہ کام کرتا ہے اس کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔

ایک اور شاعر نے اپنی زرہ کی صفت میں کہا ہے کہ عمر اُلبُسَنِيۡهِ الْهَالِكِيُّ (ہالکی

قبیلہ کے لوہار نے یہ مجھے پہنائی ہے) اور دوسرے نے کہا کہ "انہیں زرہ محرّق نے پہنائی ہے"۔ پہلے شاعر نے زرہ پہنانے کی نسبت اس کے بنانے والے کی طرف کی اور دوسرے شاعر نے اس کے استعمال کرنے والے کی طرف کی ہے۔

ایک اور شاعر نے نیزے کی صفت میں کہا ہے:

کَسَتْهَا رِيْشَهَا مَضْرَحِيَّةٌ

(اس کو شکاری پرندے نے اپنا پر پہنایا)

شاعر نے اس میں اس کے پہنانے کو اس پرندہ کی طرف منسوب کیا جس کے پروں سے وہ نیزہ بنایا گیا۔

ایک محاورہ ہے يَدَاكَ اَوْكَتَا وَفُوْكَ نَفَخَ (یعنی تمہارے ہاتھوں نے مشکیزہ باندھا اور تمہارے منہ نے اس میں پھونکا)۔ اس جملہ میں فعل کی نسبت اس آلہ (عضو) کی طرف کی جو انسان سے ملا ہوا (متصل) ہے۔ اور کہا جاتا ہے "کاٹنے والی تلوار"۔ اس میں کاٹنے کی نسبت تلوار کی طرف کی ہے جو کہ انسان سے جدا آلہ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ "فیصلہ کرنے والی مار" اور "زخمی کرنے والی ضرب"۔ ان میں فعل کی نسبت حادثہ اور واقعہ کی طرف کی گئی ہے۔ ایک اور قول ہے۔ "چھپا ہوا راز" اور "خوش زندگی"۔ ان میں فعل کی نسبت مفعول کی طرف کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "حَرَمًا اٰمِنًا" (العنکبوت: ٦٧) یعنی امن دینے والا حرم (جگہ)۔ یہاں امن دینے کی نسبت مکان کی طرف کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ يَوْمٌ صَائِمٌ وَلَيْلٌ سَاهِرٌ ("روزہ دار دن" اور "بیدار ہونے والی رات")۔ اور جیسے کسی شاعر کے اس شعر میں ہے کہ "سواری کی رات سونے والی نہیں ہوتی"[1]۔ ان تینوں اقوال میں فعل کی نسبت زمانہ اور وقت کی طرف کی گئی ہے۔

اب جبکہ ہمارے افعال کا یہ حال ہے تو کسی ایک فعل کے بارے میں یہ درست ہوگا کہ دو مختلف نقطۂ نگاہ کی وجہ سے ایک مرتبہ تو اس کی نسبت ایک سبب کی طرف

[1] پورا شعر یوں ہے ؎ لَقَدْ لُمْتِنِی یَا اُمَّ غَیْلَانَ فِی السُّرٰی + وَنِمْتِ وَمَا لَیْلُ الْمَطِیِّ بِنَائِمٍ (جریر)

کی جائے اور دوسری مرتبہ اسی نسبت کی نفی کر دی جائے۔ جیسا کہ شاعر کے اس قول میں ہے:

اَعۡطَیۡتَ مَنۡ لَمۡ تُعۡطِہٖ وَلَوِ انۡقَضٰی    حُسۡنُ اللِّقَاءِ حَرَمۡتَ مَنۡ لَمۡ تَحۡرِمٖ

(تو نے اسے دیا جسے تو نے نہیں دیا اگرچہ اچھی ملاقات ختم ہو گئی، تو نے اس کو محروم کیا جسے تو نے محروم نہیں کیا)۔

اس شعر میں ایک وجہ سے اس کے لئے فعل ثابت کیا اور دوسری وجہ سے اس سے اسی فعل کی نفی کر دی۔ کہتے ہیں: "اس لکڑی کو تم نے کاٹا ہے نہ کہ آری نے" یعنی کاٹنے کی تاثیر و قوت تمہاری ہے نہ کہ آری کی۔ اور کبھی اس طرح کہتے ہیں کہ "اسے آری نے کاٹا ہے نہ کہ تم نے"۔

اس بحث کو سمجھ لینے سے ان تمام آیات سے شبہہ زائل ہو جائے گا جن میں کبھی فعل اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور بندہ سے اس کی نفی ہوتی ہے اور کبھی وہ فعل بندہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ جیسے ان آیاتِ قرآنی میں ہے:

فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی۔

(الانفال: ۱۷)

سو تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا ہے اور جب آپ نے (خاک کی مٹھی) پھینکی تھی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

مَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ۔

(النساء: ۷۹)

آپ کو جو بھلائی بھی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو بھی برائی آپ کو پہنچے سو وہ خود آپ کی طرف سے ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو افعال ہم کرتے ہیں ان کو دو پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے،
ایک تو کرنے والے کی نسبت سے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ فلاں نے
ایسا کیا، یا فلاں نے ایسا نہیں کیا۔ دوسرے اس کام کو آسان کرنے والے، اس کی
قدرت و توفیق دینے والے اور اس کے لئے راستہ مہیا کرنے والے کی نسبت
سے دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر پروردگار کی پہلے سے نعمتیں نہ ہوں تو وہ
فعل وجود میں نہ آسکے بلکہ ہمارا کوئی فعل اور ہماری ذات بھی وجود میں نہ آسکتی۔ وہ
ذات باری تعالیٰ ہر چیز اور ہر فعل کا سببِ اولین ہے۔ اس کی ذات پاک کے سوا
جتنی چیزیں ہیں ان سب کا ہٹا دینا اور ان کی نفی کر دینا درست اور ممکن ہے لیکن
اس کی نفی کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ ذات بلند و بالا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب ہم اپنے افعال پر اور ان کو وجود میں لانے والے اسباب
پر غور کرتے ہیں تو دو نقطۂ نظر سامنے آتے ہیں۔ ایک نظر ہمارے افعال سے اس
ذات باری کے فعل کی طرف جاتی ہے جس نے اس فعل کو آسان کیا۔ یہ نظر اللہ تعالیٰ
کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ دوسری نظر اللہ تعالیٰ کے انعام کی طرف جاتی ہے۔ یعنی لسکا ہمیں قوت دینا
اور ہمارا راستہ آسان کرنا تاکہ ہم بآسانی اپنے افعال سرانجام دے سکیں اور ان کو
وجود میں لا سکیں۔ اس دوسری نظر کا تصوّر وہی کر سکتا ہے جس کو پہلی نظر کا تصوّر کرنے
کی توفیق حاصل ہو اور وہ پہلی نظر کو دوسری نظر تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنا لے۔
اسی اعتبار سے کہ ایجادِ فعل میں بندہ کا مندرجہ بالا دخل ہے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو
ایمان لانے کی دعوت دی۔ فرمایا:

| | |
|---|---|
| اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ (الحدید : ۷) | اللہ پر ایمان لاؤ |
| وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (الکھف : ۸۸) | اور جو شخص ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیے۔ |

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم: ۳۹)
اور انسان کے لئے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔

جب اللہ تعالیٰ نے انہیں خبردار کر دیا اور بندوں کے فعل کے اعتبار سے ایمان کی دعوت دی تو پھر انہیں یہ بھی بتا دیا کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ (الحجرات: ۱۷)
آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی راہ دکھائی۔

اور فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (النور: ۴۰)
اور جس کو اللہ نے (ایمان کی) روشنی نہیں دی اس کے لئے کہیں روشنی نہیں ہے۔

جب اللہ نے اس بات کو پرکھ لیا اور جان لیا کہ ان مومن بندوں میں اب اتنی قوت و صلاحیت آگئی ہے کہ وہ اس کی نعمتوں سے اپنے افعال کی طرف نظر کر سکیں گے تو فرمایا:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (الانفال: ۱۷)
سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا اور (اے محمد) جس وقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے (خاک کی مٹھی) پھینکی تھی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

جب بندوں کی اللہ کے بارے میں معرفت پوری ہو گئی تو ان مذکورہ آیات میں ان کے افعال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا لیکن ابتداء میں اس طرح نہیں کیا بلکہ بندوں کو ایمان کی دعوت دی۔

یہ پوری بحث سمجھنے کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقت میں (سب افعال کا) اصل فاعل تو صرف اللہ ہی ہے۔ کیونکہ بظاہر جتنے فاعل ہیں وہ سب اپنے فعل میں معاون کے محتاج ہوتے ہیں جیسا کہ اس بحث کی ابتداء میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے افعال کسی مادّہ، کسی خاکہ ونقشہ، کسی وقت وجگہ، کسی اوزار اور کسی رہنما کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ فاعلِ حقیقی ہے۔ اس کے سوا جتنے فاعل ہیں وہ سب مجازاً فاعل کہلاتے ہیں۔ اسی نظریہ کے ساتھ شریعت وارد ہوئی ہے اور صدرِ اوّل کے مؤمنوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ انسانوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور ارادہ کی وجہ سے ہیں۔ انہی مؤمنین نے اللہ تعالیٰ کو "شئ" بھی کہا ہے جس طرح کہ مخلوق کو شئ کہتے ہیں لیکن دونوں کے لئے استعمال میں فرق ہے۔ اس فرق کی وضاحت بعض لوگوں نے اس طرح کی ہے کہ لفظ "شئ" اصل میں "شاء" بمعنی چاہنا کا مصدر ہے۔ جب اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہو تو اس سے "شائی" یعنی چاہنے والا مراد ہوگا اور جب مخلوق کیلئے اس کا استعمال ہو تو اس سے "مشاء" یعنی چاہا ہوا مراد ہوگا۔ اور اس طرح کا استعمال لغت میں مشہور وجاری ہے، کیونکہ مصدر کو فاعل ومفعول دونوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لفظ شئ کی اس حقیقت کے تصوّر سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ لغت (زبان) بھی اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

## ان عبارات کا بیان جو بظاہر متضاد لگتی ہیں

جو لوگ عقلی دلائل یعنی منطق اور حقیقی علوم میں مہارت نہیں رکھتے وہ قرآن کریم کی بہت سی عبارتوں کو ایک دوسرے کے مخالف سمجھتے ہیں۔ بسا اوقات ملحد شخص ناواقف اور سادہ لوگوں کو ایسی عبارات کے ذریعہ مغالطہ دیتا ہے اور انہیں شک میں ڈال دیتا ہے۔ مثلاً اُن سے کہتا ہے کہ یہ بات تو اچھی طرح واضح ہے کہ ایک ہی خبر

ہیں نفی و اثبات دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر جمع ہوں گے تو ایک سچا ہوگا اور دوسرا جھوٹا جیسے یہ کہنا کہ "زید باہر ہے، زید باہر نہیں ہے"۔ حالانکہ ہم قرآن کریم میں بہت سی خبروں کو ایک دوسرے کے مخالف پاتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان میں سے ایک سچی ہو اور دوسری جھوٹی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (الطور: ۲۵)
اور وہ (جہنمی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال کرنے لگیں گے۔

ساتھ ہی دوسری جگہ فرمایا:

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (المؤمنون: ۱۰۱)
ان میں باہمی رشتے ناتے اس (قیامت کے) دن نہ رہیں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔

کافروں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا:

وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (الانعام: ۲۳)
قسم اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (النساء: ۴۲)
اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

آخرت کے بارے میں فرمایا:

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ (المرسلٰت: ۳۵)
یہ وہ دن ہے کہ وہ بولیں گے نہیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (الصّٰفّٰت: ۲۷)
اور وہ (جہنمی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال کرنے لگیں گے۔

مجرموں کے بارے میں ایک جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا (الاسراء: ۹۷) | ہم ان (مجرموں) کو قیامت کے دن منہ کے بل اٹھائیں گے وہ اندھے اور گونگے اور بہرے ہوں گے۔ |

اور دوسری جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَرَاَى الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ (الکہف: ۵۳) | اور (اس روز) گنہگار آگ کو دیکھیں گے (یعنی اندھے نہیں ہوں گے)۔ |

ایک جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا (الفرقان: ۱۳) | (مجرم) اس جگہ موت کو پکاریں گے (یعنی گونگے نہیں ہوں گے) |

اس سے پہلے فرمایا:

| | |
|---|---|
| سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا (الفرقان: ۱۲) | (مجرم) اس (دوزخ) کا جھنجلانا اور چلّانا سنیں گے۔ (یعنی وہ بہرے نہیں ہوں گے)۔ |

ایک جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الحجر: ۹۲-۹۳) | سو قسم ہے تیرے رب کی ہم کو ان سب سے پوچھنا ہے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ |

دوسری جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (الرحمٰن: ۳۹) | پھر اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہوں کی بابت پوچھا نہیں جائے گا۔ |

ایک جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (مریم: ۷۱) | اور تم میں کوئی بھی نہیں جس کا اس (جہنم) پر سے گزر نہ ہو۔ |

دوسری جگہ فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ

جن کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقدر ہو چکی ہے وہ لوگ اس (جہنم) سے دور رکھے جائیں گے۔ (الانبیاء: ۱۰۱)

اس کا جواب دینے سے پہلے ہم ایک مقدمہ اور تمہید پیش کرتے ہیں جس سے اس طرح کے شبہات دور ہو جائیں گے، ان جیسے سوالوں کے جواب کے لئے اس مقدمہ کا تصور کر لینا ہی کافی ہوگا۔ مقدمہ یہ ہے کہ دو خبریں جن میں سے ایک منفی اور دوسری مثبت ہو، وہ اسی وقت ایک دوسرے کے مخالف و منافی ہوں گی جبکہ وہ دونوں مبتدا، خبر، ان دونوں کے متعلقات، وقت، جگہ اور حقیقت و مجاز میں متفق ہوں۔ ان مذکورہ امور میں سے اگر کسی ایک میں بھی وہ مختلف ہوگئیں تو ایک دوسرے کی نقیض و منافی نہیں ہوں گی۔ مثلاً یہ دو خبریں ہیں کہ" زید مالک ہے اور زید مالک نہیں ہے"۔ اگر آپ ان دونوں زید کو دو الگ الگ شخصیت سمجھتے ہیں یا دونوں کے مالک ہونے کی وجہ میں فرق کرتے ہیں مثلاً پہلے مالک کو ملکیت کے معنی میں لے رہے ہیں اور دوسرے مالک سے باندھنے کے معنی مراد لے رہے ہیں یا پہلے مالک سے فی الحال اور بالفعل مالک مراد لے رہے ہیں اور دوسرے سے وہ مراد لے رہے ہیں جس کا مالک بننا صحیح ہے جیسے غلام یا ان میں سے ایک خبر کا حکم اصفہان اور دوسری خبر کا حکم بغداد کے لئے لے رہے ہیں یا ایک خبر کے حکم کو ایک زمانہ میں اور دوسری خبر کے حکم کو دوسرے زمانہ میں مراد لے رہے ہیں۔ تو ان تمام صورتوں میں ان دونوں خبروں میں کوئی تناقض نہیں ہوگا کیونکہ یہاں ایک خبر سے جو مراد ہے وہ دوسری خبر سے مراد نہیں ہے۔

اسی طرح اگر ایک چیز کی دو مختلف وجوہات کی وجہ سے دو متضاد صفتیں بیان کی جائیں تب بھی ان میں کوئی تضاد نہیں ہوگا۔ بلکہ دونوں صفات سچی ہو سکتی ہیں۔

مثلاً اگر کوئی شخص کسی چکی یا اپنے مرکز کے گرد گھومنے والی چرخی کے بارے میں کہے کہ وہ چل رہی ہے کیونکہ اس کے کچھ حصّے دوسرے کچھ حصّوں کے اعتبار سے جگہ تبدیل کر رہے ہیں۔ اور دوسرا شخص کہے کہ وہ نہیں چل رہی ہے کیونکہ اس کے تمام حصّے واجزاء پر نظر کی جائے تو وہ ایک ہی جگہ پر ہیں اور مرکز سے ہٹ نہیں رہے، تو ان دونوں شخصوں کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ (دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں)۔

اسی طرح جب کوئی کہے کہ فلاں شخص لکڑی کی طرح نرم ہے اور اس سے وہ اس کا سخی ہونا مراد لے اور پھر وہی اس کے بارے میں کہے کہ فلاں لکڑی کی طرح نرم نہیں ہے اور اس سے اس کا بہادر ہونا مراد لے تو اس میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔

اسی طرح ایک چیز پر دو مختلف حالتوں یا دو مختلف افراد کے اعتبار سے مختلف احکام لگتے ہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ مال اچھی چیز ہے یعنی کسی مخصوص حال میں یا کسی مخصوص فرد کی نسبت سے اور دوسرا کہے کہ مال بُری چیز ہے یعنی کسی دوسرے حال میں یا کسی دوسرے فرد کے اعتبار سے۔ اب ان دونوں خبروں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

یہی حکم ان چیزوں یا امور کا ہے جن کا کوئی اصول اور نتیجہ ہو، جیسے ایمان، شرک اور توکل۔ وہ اس طرح کہ ایمان کا اصول و معیار دو شہادتیں ہیں یعنی اللہ کی توحید اور رسالت کے اقرار کا اظہار ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گونگی باندی سے جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ مؤمن ہے۔ اور ایمان کی غایت و انتہا اور اس کے نتیجہ کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ | ایمان والے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں |

| | |
|---|---|
| وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (الانفال: ۲-۳) | اور جب ان کے آگے اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اس سے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر توکّل کرتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (صدقہ دیتے ہیں)۔ |

ایمان کی اس حالت کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان صحیح ہے کہ:

| | |
|---|---|
| لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ | زانی زنا کرتے ہوئے مومن نہیں رہتا اور چور چوری کرتے ہوئے مومن نہیں رہتا۔ |

(اخرجه اصحاب الستة بالتفصيل)

اس بناء پر یہ بھی ثابت ہوا کہ جو چیز بھی دو مختلف چیزوں سے مرکّب ہو یا جس کے لئے ابتداء و انتہا ہو (یعنی اس کے اصول و مقاصد ہوں) جیسا کہ ابھی یہ بحث گزری تو اس چیز پر چار مختلف احکام صادق ہو سکتے ہیں۔ جیسے یہ کہا جائے کہ سکنجبین میٹھی ہے، سکنجبین کھٹی ہے، سکنجبین کھٹ میٹھی ہے۔ سکنجبین نہ کھٹی ہے اور نہ میٹھی ہے (تو چاروں قول درست ہوں گے)۔

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد مذکورہ آیات پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں ان کا جواب آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ ان آیات میں جو بظاہر تضاد نظر آرہا ہے وہ ان مذکورہ اسباب میں سے کسی ایک سبب کی بنا پر ہے۔

# اللہ تعالیٰ کا کلام تمام علمی اور عملی حکمتوں پر مشتمل ہے

درحقیقت اللہ تعالیٰ کی کتاب تمام علمی حکمتوں اور اشارات پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِىٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ (یٰسٓ : ۱۲)
ہم نے ہر چیز ایک کھلی اصل میں گن لی ہے اور احاطہ کر لی ہے

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِى بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف : ۱۱۱)
یہ قرآن کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن اس کلام کے موافق ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے اترا ہے اور یہ ہر چیز کا بیان ہے۔

مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتَٰبِ مِن شَيْءٍ (انعام: ۳۸)
ہم نے کتاب میں کوئی چیز (لکھے بغیر) نہیں چھوڑی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ تِبْيَٰنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۸۹)
اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حکمتیں اور اشارات علوم میں راسخ و ماہر پر ہی ظاہر ہوتی ہیں۔ تمام حکمتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان:

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِىَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرۃ: ۲۶۹)
اور جس کو حکمت ملی اس کو بڑی خوبی اور بھلائی ملی۔

کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے اور اس کے سمجھنے میں علماء کے درجات مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ
اگر یہ لوگ کسی خبر یا افواہ کو لوگوں میں پھیلانے

أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ (النساء : ۸۳)

سے پہلے) اس کو رسول تک اور اپنے حاکموں تک پہنچا دیتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں وہ اس (کی حقیقت) کو جان لیتے۔

قرآن کے حقائق سمجھنے میں اکثر لوگوں کے لئے جو مشکلات ہیں ان کی وجوہات میں سے دو بڑی وجہ ہیں۔ ایک وجہ کا تعلق لفظ سے ہے اور دوسری کا تعلق معنی سے ہے۔ لفظی وجہ کی دو قسمیں ہیں :۔

ایک قسم تو یہ ہے کہ عربی زبان میں جو اختصار، حذف، استعارہ اور لطیف اشارات ہیں یہ عربی زبان ہی کی خصوصیت ہے کسی دوسری زبان میں یہ بات نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ قرآن میں جو خاص طور پر اختصار اور حذف ہے وہ کسی دوسرے کلام میں نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کا ایک چھوٹا سا لفظ بہت سے معانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ (صحیح مسلم) مجھے جامع کلمات دیئے گئے ہیں۔

قرآن کے ایجاز و جامعیت کی مثال :۔ اللہ نے اپنے اولیاء سے ناگوار اسباب کے دور ہونے کی صفت کس ایجاز و جامعیت سے بیان کی ہے۔ فرمایا :

لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس : ۶۲) ان کو نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کوئی افسوس کریں گے۔

اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی تکلیف کی نفی کر دی کیونکہ تمام تکالیف ناگوار چیز کے حاصل ہونے اور محبوب چیز کے ہاتھ سے نکل جانے سے ہوتی ہیں۔

اہلِ جنّت کے پھلوں کے بارے میں فرمایا :

لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ — جو نہ ختم ہوں گے اور نہ ان کی روک ٹوک ہوگی۔

(الواقعہ : ۳۳)

اس آیت میں دنیا کے کھانوں پر جتنی بھی آفات و بیماریاں آتی ہیں، ان سب کی نفی کردی۔

اہلِ جنت کی شراب کی صفت یوں بیان کی :

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ — نہ اس سے سر پھرتا ہے اور نہ وہ اس کو پی کر بہکیں گے۔

(الصّٰفّٰت : ۴۷)

شراب کی وجہ سے جتنی بھی ناگوار چیزیں پیش آتی ہیں اس آیت میں ان سب کی نفی کردی۔

فرعون اور اس کی نعمتوں کا حال اللہ تعالیٰ نے مختصر و جامع الفاظ میں بیان فرمادیا۔ فرمایا :

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ — وہ بہت سے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ گھر اور آرام کا سامان چھوڑ گئے جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے۔

(الدخان : ۲۵-۲۷)

اللہ تعالیٰ نے ان مختصر کلمات میں وہ سب چیزیں بیان کردیں جن کا بیان کئی صفحات میں آتا۔

نیز کسی قصّہ کو بیان کرتے ہوئے جن چیزوں کا علم سامع کو خود ہوجاتا ہے انہیں بیان نہیں کیا بلکہ اس کے بعد والی چیز بیان کی مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ — (اے موسیٰ) اپنی لاٹھی دریا پر مارو۔ پھر وہ (دریا) پھٹ گیا۔

(الشعراء : ۶۳)

اس آیت میں لاٹھی مارنے کا حکم مذکور ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے جو کام کیا وہ اور ان کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریا میں داخل ہونا مذکور نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا علم قاری کو خود ہو جائے گا۔

قرآن کے حقائق سمجھنے میں معنوی مشکلات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اصول ذکر فرمائے ہیں۔ یہ اصول فروعات پر مشتمل ہیں۔ بعض فروع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیں اور بعض فروع کا استنباط علوم میں ماہر و راسخ افراد کے سپرد کر دیا تاکہ ان کا شرف ظاہر ہو اور اس امت کے علماء کا مرتبہ استنباطِ احکام میں پچھلے انبیاء کے درجہ کے قریب ہو جائے۔ اس امت کی اسی خصوصیت کی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت انبیاء ہونے کے قریب ہے"۔ (مسند احمد بمعناہ)۔

اسی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرۃ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا۔

اور فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)

تم سب امتوں سے بہتر ہو جو انسانوں کی طرف (ہدایت کے لئے) بھیجی گئی۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کو استنباطِ احکام اور تبلیغ میں انبیاء کے درجہ میں رکھا ہے۔

## قرآن کا براہین و دلائل پر مشتمل ہونا

دلائل عقلیہ و نقلیہ کی اصولی طور پر جتنی قسمیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں

وہ سب بیان کر دی ہیں مگر ان کا طرزِ بیان عرب کی عادت کے موافق ہے نہ کہ فلاسفہ اور متکلمین کے طرز پر۔ اس کی دو وجہ ہیں:۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراھیم:۴)
اور ہم نے تمام پیغمبروں کو ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ ان سے بیان کریں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دقیق اور باریک دلائل وہی شخص بیان کرتا ہے جو واضح کلام سے دلیل قائم نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ جو شخص ایسے واضح کلام کے ذریعہ لوگوں کو سمجھا سکتا ہے جسے اکثر لوگ سمجھ لیتے ہیں تو وہ ایسے گہرے اور دقیق کلام کا سہارا نہیں لیتا جسے بہت کم لوگ سمجھتے ہیں کہ کہیں وہ بالکل معمانہ بنا رہ جاتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے سامنے دلائل دیتے ہوئے ایسی صورت میں خطاب کیا کہ وہ واضح ہونے کے ساتھ ساتھ دقیق دلائل پر بھی مشتمل ہو تاکہ عام افراد اس واضح کلام سے اتنا سمجھ لیں جو ان کے لئے کافی ہو اور ان کے شکوک و شبہات ختم ہو جائیں اور خواص بھی اسی دوران ان دلائل کو سمجھ لیں جو حکماء و فلاسفہ کی فہم کے مطابق اور ان کے طرز پر ہوں۔ اسی چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:۔

اِنَّ لِكُلِّ اٰيَةٍ ظَهْرًا وَّبَطْنًا وَّلِكُلِّ حَرْفٍ حَدًّا وَّمُطَّلَعًا (مشکوٰۃ)
ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حرف کی ایک حد و غایت ہے اور ہر غایت و مقصد کو جاننے کا ایک راستہ اور ذریعہ ہوتا ہے۔

یہاں ظاہر و باطن کا وہ مطلب نہیں ہے جو باطنیہ نے مراد لیا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس شخص کو علوم میں خوب مہارت ہو گی تو علمِ قرآن میں بھی اس کو اچھی دستگاہ ہو گی۔ اسی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت اور وحدانیت

کی دلیل بیان فرماتا ہے تو اس کے بعد اس کو کبھی عقل والوں کی طرف، کبھی علم والوں کی طرف کبھی سامعین کی طرف، کبھی غور و فکر کرنے والوں کی طرف اور کبھی نصیحت حاصل کرنے والوں کی طرف منسوب کرتا ہے، اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ ان قوتوں کے ذریعہ مذکورہ دلیل کی حقیقت کا ادراک ممکن ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ — ان چیزوں میں ان کے لئے نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔ (الرعد: ۴)

اسی طرح اور دیگر آیات میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

# دین کے بنیادی احکام اور ان کا نسخ

شریعت جن احکام پر مشتمل ہوتی ہے وہ چھ قسم کے ہیں: اعتقادات، عبادات، مشتہیات، معاملات، سزائیں و تنبیہات اور اخلاقیات۔

اعتقادات پانچ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات کا اقرار (۲) ان فرشتوں پر ایمان جو اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان سفیر ہیں۔ (۳) آسمانی کتابیں (۴) رسول و انبیاء۔ (۵) آخرت۔ ان تمام پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مشتمل ہے:

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء: ۱۳۶) — اور جو کوئی ایمان نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر (آخر آیت تک)

عبادات آٹھ قسم کی ہیں: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، اعتکاف، قربانی اور کفارات۔

مشتبہات چار قسم کے ہیں : کھانے کی چیزیں ، پینے کی چیزیں ، نکاح اور لباس ۔
معاملات چار قسم کے ہیں : معاوضات جیسے خرید و فروخت ، کرایہ اور ان جیسے دوسرے معاملات ۔ عدالتی مقدمات جیسے دعویٰ اور دلیل ۔ امانات جیسے امانت اور عاریت ۔ ترکہ جیسے وصیت اور میراث ۔
سزائیں پانچ قسم کی ہیں :۔ انسانی جانوں کی حفاظت کے لئے قتل پر سزا جیسے قصاص اور دیت ۔ عزت کی حفاظت کے لئے سزا جیسے تہمت لگانے اور برے کام کرنے کی سزا ۔ نسب کی حفاظت کے لئے سزا جیسے کوڑے مارنا اور سنگسار کرنا ۔ اموال کی حفاظت کے لئے سزا جیسے ہاتھ کاٹنا اور پھانسی دینا ۔ دین و ملت کی حمایت کے لئے سزا جیسے مرتد کو قتل کرنا اور باغیوں سے جنگ کرنا ۔

## اخلاقیات کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) وہ آداب جن کی ہر انسان کو اپنی اصلاح کے لئے ضرورت ہے ۔ جیسے علم، بردباری ، سخاوت ، عفت و پاکیزگی ، بہادری ، وفاداری اور تواضع ۔
(۲) اپنے ساتھ رہنے والوں اور معاشرہ کے مخصوص افراد کے حقوق جیسے والدین کے ساتھ اچھا سلوک ، رشتہ داری نبھانا (صلہ رحمی) پڑوسی کی حفاظت اور اس کے حقوق کا خیال رکھنا ، فقیروں کی غمخواری کرنا ، مظلوم کی مدد کرنا، مصیبت زدہ کی مدد کرنا ۔
(۳) حکام کے فرائض جیسے رعایا کے لئے اچھا انتظام حکومت کرنا شرعی احکام اور اخلاقِ عامہ میں یہ فرق ہے کہ شریعت کے احکام کی مقدار اور کیفیت متعین ہوتی ہے اور ان احکام کو چھوڑنے والے کے لئے سزا بھی مقرر و معین ہوتی ہے جب کہ اخلاقِ عامہ کے احکام کی مقدار اور کیفیت غیر متعین ہوتی ہے اور اخلاقی احکام کی پابندی نہ کرنے والوں کے لئے کوئی مخصوص سزا بھی نہیں ہوتی بلکہ اسے نیک لوگوں کی

رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ — اور ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کو علم ہے۔

(عنکبوت: ۴۳)

اکثر احکامات اللہ تعالیٰ نے (سورۂ بنی اسرائیل کی) ان آیات میں بیان فرمائے ہیں:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ الآیۃ — اور تیرے رب نے حکم و فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل ۲۳ تا ۳۹) — یہ باتیں حکمت میں سے ہیں جو آپ کے رب نے آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجی ہیں۔

ان آیات میں بہت سے احکامات اخلاق سے متعلق جمع ہیں۔

احکامات کی ان چھ اقسام میں سے سب سے بہتر قسم اعتقادات ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق علم و عقیدہ سے ہے جبکہ بقیہ کا تعلق عمل سے ہے۔ علم ہر چیز کی ابتداء اور مبداء ہے جبکہ عمل اس کی انتہاء و انجام ہے۔ اور انتہاء بغیر ابتداء کے نہیں ہو سکتی جبکہ ابتداء بغیر انتہاء کے ہو سکتی ہے۔ نیز علم اصل ہے اور عمل اس کی فرع۔ اور کوئی فرع اصل کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی جس طرح کہ اصل میں بغیر فرع کے کوئی کمال پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعتقاد عمل پر مقدم ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان اعتقادی اختلاف عمل کے اختلاف سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ نیز اگر اعتقاد فاسد و غلط ہے تو اچھے اعمال بھی بُرے اور خراب ہو جاتے ہیں۔ اعتقاد کے بعد دوسرا نمبر عبادت کا ہے۔ اس لئے کہ جو شخص نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور ناپاکی سے پاک ہونے کے لئے غسل کرنے میں کوتاہی کرتا ہے اور یہ اعمال نہیں کرتا تو وہ مسلمانوں کے نزدیک ظلم سے زیادہ بڑا گناہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے نزدیک ہفتہ کے دن کی

عبادت اور اس کے دیگر لوازم کو چھوڑنا، عیسائیوں کے نزدیک عبادت کو چھوڑنا اور مجوسیوں کے نزدیک زمزمہ کو چھوڑنا بندوں پر ظلم کرنے سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے جبکہ ظلم سے بچنا اللہ کے ان احکامات کی حفاظت کرتا ہے جو بندوں سے متعلّق ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ عابد اعلیٰ و افضل ہے اس شخص سے جو صرف ظلم کرنے سے بچا ہوا ہو۔

اب ان احکامات کا ذکر ضروری ہے جن کا منسوخ ہونا جائز ہے اور جن کا منسوخ ہونا جائز نہیں ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ نسخ عبادت کے صرف ان احکامات میں جاری ہوگا جو کہ امر و نہی ہیں۔ اس لئے ان اعتقادی خبروں میں نسخ جاری نہیں ہوگا جن کے بارے میں یہ حکم ہے کہ جس طرح خبر دی گئی ہے اسی طرح اعتقاد رکھو۔ ہمارا اعتقاد خبر کے مطابق ہوتا ہے اور وہ تبدیل نہیں ہوتا۔ اخلاقیات بھی عقل سے ثابت ہیں، شریعت ان کے خلاف وارد نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کا بھی نسخ سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ عبادات، معاملات اور تعزیرات کے اصولی احکام میں بھی نسخ جاری نہیں ہوگا، ہاں ان کے فروعی احکام میں نسخ جاری ہو سکتا ہے۔ اصولی احکام میں نسخ جاری نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شریعت کا اللہ کی عبادت سے خالی ہونا محال ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ اس میں کوئی بدنی عبادت مثلاً نماز، مالی عبادت مثلاً زکوٰۃ، شہوت توڑنے والی عبادت مثلاً روزہ نہ ہو۔ یہ بھی محال ہے کہ معاملات میں انصاف برتنے کا کوئی حکم نہ ہو، ظلم و فساد سے روکنے کے احکام نہ ہوں، ایسی کوئی تعزیر اور سزا نہ ہو جو انسانی جانوں کو قتل کرنے اور ان کی عزت، مال اور نسب کو خراب اور ضائع کرنے سے لوگوں کو روکے۔ ہاں ان عبادات کی صورتیں، وقت اور مقدار یہ سب فروعات ہیں، ان میں نسخ جاری رہا ہے اور ہر قوم کی مصلحت کے مطابق اللہ نے احکام کی فروعات میں تبدیلی کی ہے۔

اصولی احکام میں نسخ جاری نہ ہونے پر قرآن شریف کی یہ آیات دلالت کرتی ہیں:

| | |
|---|---|
| شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ (الشوریٰ : ۱۳) | اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ |

اور فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینۃ : ۵) | اور ان کو حکم یہی ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں صرف اسی کے واسطے بندگی کو خالص کرکے۔ |

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ نقل کیا:

| | |
|---|---|
| وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم : ۳۱) | اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک کہ میں زندہ رہوں۔ |

زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (حٰمٓ السجدۃ : ۶-۷) | اور مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔ |

قبلہ کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ (الحج : ۶۷) | ہر امّت کے لئے ہم نے بندگی کی ایک راہ مقرر کر دی ہے کہ وہ اسی طرح بندگی کرتے ہیں۔ |

روزہ کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ | تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسے فرض کیا گیا تھا |

| | |
|---|---|
| عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرۃ: ۱۸۳) | تم سے اگلوں پر۔ |

اعتکاف کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرۃ: ۱۲۵) | اور پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔ |

قربانی کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا (المائدہ: ۲۷) | اور ان کو آدم کے دو بیٹوں کا حال واقعی سُنا جب دونوں نے قربانی پیش کی۔ |

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کا قول نقل کیا:

| | |
|---|---|
| اَلَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَا اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ (اٰل عمران: ۱۸۳) | وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا جب تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جس کو آگ کھا جائے۔ |

جہاد کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ (اٰل عمران: ۱۴۶) | اور بہت سے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں۔ |

قصاص کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ: ۴۵) | اور ہم نے ان پر اس کتاب میں لکھ دیا کہ جان کے بدلہ جان۔ |

کھانے اور پینے کی چیزوں کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ (آل عمران: ۹۳) | سب کھانے کی چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں سوائے ان چیزوں کے جن کو یعقوب نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا (نزولِ تورات سے قبل) |

اور فرمایا:

| | |
|---|---|
| فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء: ۱۶۰) | سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے ان پر بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں حرام کردیں۔ |

سزاؤں کے بارے میں فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ (البقرة: ۲۵۱) | اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض افراد کو دوسرے لوگوں سے دفع کراتے رہتے ہیں تو سرزمین فساد سے پُر ہوجاتی۔ |

دوسری جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ (الحج: ۴۰) | (اگر ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعہ دفع کرانا نہ ہوتا) تو منہدم ہوجاتے عیسائیوں اور یہودیوں کے عبادت خانے۔ |

اور فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً (الاسراء: ۳۲) | اور زنا کے قریب بھی مت جاؤ بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے۔ |

آداب کے بارے میں حضرت لقمان علیہ السلام کی وصیتیں ذکر کیں جو انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمائی تھیں۔ فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ | اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر |

فِي الْاَرْضِ مَرَحًا (لقمان : ۱۸) اِترا کر مت چل۔

اس کے علاوہ مزید آیات ہیں۔ ان سب میں زیادہ تاکیدی آیات یہ ہیں :

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ ... کامیاب ہوا وہ شخص جو پاک ہوا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔ ------ مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔....

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (الاعلیٰ: ۱۴ تا ۱۹) یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے یعنی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔

فروعات کے بارے میں فرمایا :

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدة : ۴۸) تم میں سے ہر ایک کو ہم نے ایک دستور اور راہ دی۔

اگر کہا جائے کہ تنبیہات اور سزائیں ہر شریعت میں نہیں تھیں، جیسا کہ بعض نے کہا کہ عیسائیوں میں سزائیں نہیں تھیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے: "اگر تم میں سے کسی کے چہرہ کے ایک جانب چانٹا لگے تو وہ دوسری جانب بھی (مارنے والے کو) پیش کر دے" اور ان کا فرمان ہے کہ "لوگوں کو گفتگو و کلام کے ذریعہ دین کی طرف بلاؤ لڑائی کے ذریعہ نہیں"۔ کسی نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ تنبیہ اور سزا جس طرح جسمانی تکلیف دے کر ہوتی ہے اسی طرح گفتگو اور کلام کے ذریعہ بھی ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ ان کی شریعت میں بھی سزائیں تھیں۔ نیز ان کی سزائیں تورات میں وارد ہوئی ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف تورات کے ذکر پر اکتفاء فرمایا، خود سے سزائیں ذکر نہیں کیں اور چانٹا لگنے کی صورت میں دوسری جانب پیش کرنے کا جو فرمان ہے تو وہ معاف کرتے اور تکلیف برداشت کرنے

پر ابھارنا ہے (جو ہر شریعت میں ہوتا ہے)۔

# منسوخ ہونے اور خاص کرنے میں فرق

نسخ اور مسخ دونوں کے معنی قریب قریب ہیں۔ خلیل نے بھی یہی کہا ہے۔ مگر لفظ مسخ چیزوں کی منتقلی میں استعمال ہوتا ہے اور لفظ نسخ صورت کی منتقلی میں۔ جیسے یہ کہنا کہ نَسَخَ الْکِتَابَ یعنی کتاب کے نقوش کی صورت کو دوسری طرف منتقل کر لیا پہلی کتاب کے نقوش کو باطل کئے بغیر۔ اور کہتے ہیں کہ نَسَخَ الظِّلُّ الشَّمْسَ یعنی سایہ نے دھوپ کو دور کر دیا۔

نسخ کی حقیقت یہ ہے کہ شریعت سے ثابت حکم کو کچھ زمانہ کے بعد شریعت کے دوسرے حکم سے زائل کر دینا۔

منسوخ ہونے اور خاص کرنے میں یہ فرق ہے کہ خبر کو خاص کیا جاتا ہے منسوخ نہیں کیا جاتا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ خاص کرنے سے مراد یہ ہے کہ جن چیزوں اور معانی مقامات کے بارے میں خطاب وارد نہیں ہوا ہے انہیں عام حکم میں سے نکال دینا (یعنی یہ بتلانا کہ یہ چیزیں اس حکم میں داخل نہیں ہیں)۔ اور منسوخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم کسی مخصوص زمانہ میں نافذ نہ کرنا ہو اس کو نکال دینا (یعنی وہ حکم پہلے زمانہ میں ثابت تھا پھر دوسرے زمانہ میں وہ حکم باقی نہیں رہا، تو اس کے بارے میں یہ بتلانا اسے منسوخ کرنا ہے)۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ حکم اور اس کو خاص کرنا اکثر ایک ساتھ ہوتے ہیں خواہ لفظوں میں ایک ساتھ ہوں یا تقدیری طور پر ایک ساتھ ہوں۔ جبکہ جس حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے وہ حکم پہلے سے ہوتا ہے اور منسوخی کا حکم بعد میں آتا ہے۔ اگر منسوخی کا حکم بھی

ایک ساتھ ہو (یعنی منسوخ و ناسخ کا زمانہ ایک ہو) تو اسے خاص کرنا کہتے ہیں۔ نیز منسوخ کرنا بھی حقیقت میں خاص کرنے کی ایک قسم ہے مگر یہ کہ عرف عام میں یہ دونوں مختلف ہیں۔

جن حضرات نے ناسخ و منسوخ کے بارے میں کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں سے بہت سے افراد نے ان احکام کو بھی ناسخ سمجھ لیا جو کہ کسی مجمل کا بیان ہیں یا کسی عام کو خاص کرنے کے لئے ہیں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (النساء: ۱۰) | جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں۔ |

بعض نے کہا کہ اسے اس آیت نے منسوخ کر دیا:

| | |
|---|---|
| وَمَنْ کَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ وَمَنْ کَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْکُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء: ۶) | اور جس کو حاجت نہ ہو تو وہ مالِ یتیم سے بچتا رہے اور جو کوئی محتاج ہو تو دستور کے موافق کھائے۔ |

حالانکہ یہ اس چیز کا بیان ہے جس کا ان یتیموں کے مال میں سے کھانا ظلم نہیں ہے۔

دوسری مثال۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (البقرۃ: ۲۱۹) | وہ آپ سے شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں فرما دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں۔ |

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شراب حرام نہیں ہے۔ پھر اس حکم کو مندرجہ ذیل آیت نے منسوخ کر دیا:

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ | بے شک شراب اور جوا اور بت ناپاک چیزیں |

رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ — ہیں شیطانی اعمال سے ہیں ان سے بچتے رہو تاکہ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدۃ: ۹۰) — تم فلاح پاؤ۔

حالانکہ یہ بھی پہلی آیت کا بیان ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا نقصان اس کے فائدہ سے زیادہ ہو تو عقل اس چیز سے بچنے کا تقاضا کرتی ہے لیکن جبکہ یہ حکم ممانعت میں صریح نہیں تھا تو اسے دوسری آیت سے مؤکّد کر دیا۔

تیسری مثال۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ — اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک
(البقرۃ: ۲۲۱) — کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

معلوم ہوا کہ مشرک عورت سے نکاح جائز نہیں ہے۔ لیکن اس کی ناسخ یہ دوسری آیت ہے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ — اور اہل کتاب میں سے پاکدامن عورتیں (تمہارے لئے
(المائدۃ: ۵) — حلال کی گئی ہیں)

حالانکہ دوسری آیت پہلی آیت کے حکم کو خاص کر رہی ہے۔

اسی طرح ایک حکم کو خاص کرنے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ — (گھروں میں) بیٹھ رہنے والے مسلمان اور
وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — وہ مسلمان جو اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہیں
(النساء: ۹۵) — (باہم) برابر نہیں ہیں۔

تو یہ آیت ان مسلمانوں پر شاق گزری جو کسی بیماری یا تکلیف میں مبتلا تھے تو اللہ تعالیٰ نے (الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ) کے ساتھ "غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ" کا فرمان نازل کیا۔ (یعنی ان بیٹھ رہنے والوں کے حکم میں بیمار اور معذور شامل نہیں ہیں)۔

# کیا قرآن میں ایسے کلمات بھی ہیں جن کا مطلب اُمّت نہیں جانتی

اس بارے میں اختلاف ہے۔ اکثر متکلمین کا یہ قول ہے کہ پورے قرآن کا معلوم و مفہوم ہونا ضروری ہے ورنہ قرآن کا قابلِ انتفاع ہونا باطل ہوگا، نیز قرآن کو نازل کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوگا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

"وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ"، کو "مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ" سے ملایا ہے اور "يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ" کو ان کا حال مراد لیا ہے۔ اس طرح آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ

"قرآن کے کلمات کا مطلب کوئی نہیں جانتا مگر اللہ اور علم میں ماہر و راسخ افراد اس حال میں کر وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے"۔ جس طرح کہ اس شعر میں اسی ..... قسم کی ترکیب ہے ؎

اَلرِّيحُ يَبْكِيْ شَجْوَهَا     وَالْبَرْقُ يَلْمَعُ فِيْ غَمَامِهِ

ترجمہ: ہوا اپنے غم کو روتی ہے اور بجلی بادلوں میں چمکتی ہوئی روتی ہے۔

اس شعر میں "البرق" لفظ "یبکی" کا فاعل ہے اور "یلمع" برق کے لئے حال ہے یعنی بجلی چمکتی ہوئی روتی ہے۔ ان حضرات نے آیت کا جو مطلب بیان کیا ہے اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ ان کی قرأت "وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ" ہے یعنی اس میں واؤ ہے جو حال کے معنی دے رہا ہے۔ بزرگ صحابہؓ اور اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں بعض کلمات ایسے ہیں جن کا مطلب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: "قرآن کی آیات کی چار قسمیں ہیں: ایک قسم حلال و حرام کی آیات ہیں۔ ان آیات سے لاعلم ہونے کی کسی

کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ دوسری قسم کی وہ آیات ہیں جنہیں اہلِ عرب اچھی طرح فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ تیسری قسم کی وہ آیات ہیں جن کا مطلب صرف عالم جانتے ہیں۔ چوتھی قسم کی وہ آیات ہیں جن کا مطلب صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ان آیات کا مطلب جاننے یا بتانے کا کسی نے دعویٰ کیا تو اس نے جھوٹ بولا۔" انہوں نے آیت "مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ" کی تفسیر میں فرمایا کہ اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ ہو سکتا ہے کہ تاویل سے مراد چیزوں کی حقیقت یعنی ان کی کیفیت، زمانہ اور بہت سے حالات اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ بہت سی عبادات اور اعتقادی خبریں جیسے قیامت، مرنے کے بعد زندہ ہونا، دابۃ الارض، ان کی حقیقت اور زمانہ کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے:

| | |
|---|---|
| هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ (الآية) (اعراف: ۵۳) | کیا اب اسی کے منتظر ہیں کہ اس کی حقیقت ظاہر ہو جائے جس دن اس کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی تو جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے ہوئے ہوں گے وہ کہیں گے |

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن کے بارے میں ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم صرف ان کی تلاوت کریں۔ ان الفاظ کا مطلب جانے بغیر ہم ان کی تلاوت کے عبادت ہونے کا یقین رکھیں جس طرح کہ ہم بہت سی عبادات جیسے نماز اور حج میں ادا کی جانے والی جسمانی حرکات کے عبادت ہونے کا یقین رکھتے ہیں حالانکہ ہم ان حرکتوں کی حکمت بھی نہیں جانتے۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا (جو ایک زمانہ میں یہودیوں کو دیا گیا تھا):

| | |
|---|---|
| وَقُولُوا حِطَّةٌ (البقرة: ۵۸) | اور کہتے جاؤ حِطَّۃٌ (یعنی بستی کے دروازہ میں داخل ہوتے وقت حِطَّۃٌ کہو)۔ |

یعنی انہیں بس یہی لفظ کہنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس لفظ کو بدل کر دوسرا لفظ کہنا شروع کر دیا تو سزا ملی)۔

تیسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سی آیات ہیں جن کی تفسیر میں مفسّرین کا اختلاف ہے۔ ہر ایک نے آیت کے احتمال کے مطابق آیت کی مختلف تفسیر کی ہے اور کسی ایک قول کو قطعی قرار نہیں دیا۔ سو ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی مراد ہمیں تفصیلی طور پر ایسی معلوم نہیں کہ ہم اسے قطعی و صحیح قرار دے سکیں۔

جن لوگوں نے دوسرا قول اختیار کیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ اس قسم کی آیات اُس قوم کی تردید و انکار کے لئے نازل ہوئی ہیں جس نے ایسے امور معلوم کرنے کی بہت زیادہ طمع کی ہے جن کے معلوم کرنے کا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں زیادہ غور و خوض کے اسباب بند کرنے کا ارادہ کیا، اور جس نے ان آیات کا مطلب معلوم کرنے کی کوشش کی اس کی الجھن ختم نہیں ہوئی اور تسلّی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیات صرف چند مخصوص افراد کے لئے ہیں تو یہ تو وہی بات ہو جائے گی جو فرقہ امامیہ کہتے ہیں کہ قرآن کی بعض آیات کا مطلب صرف امام ہی جانتا ہے، اور وہ اپنی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (الاٰية) | لیکن جو لوگ ان میں سے علم میں پختہ ہیں اور ایمان والے ہیں مانتے ہیں اس کو جو نازل ہوا آپ پر اور جو نازل ہوا آپ سے پہلے۔ |

(النساء: ۱۶۲)

# بعض آیات کو متشابہ بنانے کی حکمت

کسی عابد سے سوال کیا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ قرآن کی بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ۔ تمام آیات کو محکم کیوں نہیں رکھا گیا، تاکہ انسان ان میں غور وفکر کرنے کی مشقت سے بچ جاتا۔ کیونکہ غور وفکر میں سلامتی اور لغزش نہ ہونا بہت ہی کم ہے؟ یہی سوال ہم احکام کے متعلّق بھی کر سکتے ہیں کہ تمام احکامات کو بیان کیوں نہیں کر دیا گیا تاکہ رائے دینے کی محنت نہ کرنا پڑتی۔ کیونکہ رائے دینے میں خطاء کا احتمال ہے۔ بلکہ اور ترقی کر کے مکلّف بنانے کے متعلّق سوال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں انعامات بغیر مشقت کے کیوں نہیں دے دیئے تاکہ اس کی عطا خوشگوار عطیہ ہوتی۔

عابد نے کہا کہ ان تمام شبہات کا ایک ہی جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو غور وفکر کرنے اور مختلف چیزوں کے درمیان تمیز کرنے کی خصوصیت عطا فرمائی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (الاسراء: ۷۰)
اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

انہی صفات کی بناء پر اسے زمین میں خلیفہ بنایا۔ فرشتوں سے فرمایا:

اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرة: ۳۰)
میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

اور فرمایا:

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ (النور: ۵۵)
ان کو زمین میں حکومت وخلافت عطا فرمائے گا۔

اور فرمایا:

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ اور تم کو ملک میں خلیفہ کر دے گا۔

(الاعراف: ۱۲۹)

اور فرمایا:

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا (هود: ٦١) اور تم کو زمین میں بسایا۔

یہ مرتبہ جو انسان کو عطا فرمایا ہے انسان کے شرف و برتری کے لئے کافی ہے۔ انسان ان صفات کی وجہ سے عالم، بردبار اور حکیم ہو گیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات انسان کے لئے ثابت ہوئیں، اگرچہ ان کی حقیقت وہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس فضیلت یعنی غور و فکر کے ساتھ مختص فرمایا اور اسے بہت سی چیزوں کی معرفت عطا فرمائی لیکن ان چیزوں کی کامل معرفت عطا نہیں کی تاکہ انسان غور و فکر سے کامل معرفت حاصل کرے، ورنہ غور و فکر کی صلاحیت دینے کا فائدہ معطل و بے کار ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کے لئے یہ بات ثابت ہوتی کہ اس نے ایسی چیز پیدا کی جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے۔

اسی طرح کھانے پینے کی چیزوں کے احوال ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پیدا کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے تمام احوال انسان کو ابتداء میں نہیں بتائے بلکہ بنیادی غذائیں پیدا کیں اور پھر انسان کو یہ رہنمائی عطا کی کہ وہ غور و فکر سے کام لے کر ان بنیادی غذاؤں کو ملا کر نئی غذائیں حاصل کرے۔ ان غذاؤں کو کس طرح استعمال کرنا چاہیئے اور کب استعمال کرنا چاہیئے، غور و فکر کے ذریعہ اس کو معلوم کرنے کا طریقہ بتایا۔

جب یہ مقدمہ ثابت ہو گیا تو اب یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور

اس کے احکام و شرائع اور اس کے دیگر تمام معانی و مطالب کی دو قسمیں ہیں جلی (واضح) خفی (پوشیدہ)۔ جلی سے مراد وہ مطالب ہیں جن کا ادراک ہم حواس یا عقل کے ذریعہ کر سکیں، اور خفی سے مراد وہ مطالب ہیں جن کا ادراک ہم ان دونوں ذرائع سے نہ کر سکیں۔ پس پاک ہے وہ ذات جس نے انسان کو اس اعلیٰ درجہ سے مشرف فرمایا تاکہ یہ درجہ ہمیشہ کی زندگی اور ایسی نعمتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنے جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے (ان کے بارے میں) سُنا اور نہ کسی کے دل میں ان کا خیال گزرا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ (السجدۃ: ۱۷)

ان کے لئے جو آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے (اس کی حقیقت) کسی کو معلوم نہیں ہے۔

# علم تفسیر کی فضیلت

انسان جو فنون حاصل کرتا ہے ان میں سب سے بہترین فن قرآن کی تفسیر و تاویل ہے، اس لئے کہ ہر فن کو مندرجہ ذیل تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے فضیلت حاصل ہوتی ہے:

۱۔ اگر کسی علم کا موضوع شرف و فضیلت والا ہو تو وہ علم بھی فضیلت والا ہوتا ہے، کیونکہ ہر علم میں کسی موضوع سے متعلق ہی بحث ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ زرگری کا فن کھالوں کی صفائی (دباغت) کے فن سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ زرگری کا موضوع یعنی سونا چاندی دباغت کے موضوع یعنی مردار جانوروں کی کھال سے بہتر ہے۔

۲۔ یا اس کی صورت شکل کے اچھا ہونے کی وجہ سے، جیسے کہا جاتا ہے کہ تلواروں کی ڈھلائی کا فن زنجیریں ڈھالنے کے فن سے بہتر ہے۔

۳۔ یا اس کے اغراض و مقاصد کی برتری کی وجہ سے، جیسے کہ ڈاکٹری کا فن خاکروبی کے فن سے بہتر ہے۔ کیونکہ ڈاکٹری کا مقصد (بیماروں کی) صحت و تندرستی بحال کرنا ہے اور خاکروبی کا مقصد فرش کی صفائی کرنا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو معلوم ہونا چاہیئے کہ فن تفسیر کو ان تینوں وجوہ سے شرف حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو کہ ہر حکمت کا سرچشمہ اور ہر فضیلت کی کان ہے، اور تفسیر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی صورت ان مخفی اور سربستہ رازوں کا اظہار ہے جنہیں اس قرآن کو نازل کرنے والے نے قرآن میں رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِيَدَّبَّرُوٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (صٓ: ۲۹) — تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ عقل مند نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر کا مقصد (خدا تعالیٰ کی) اس مضبوط رسی اور کڑے کو پکڑنا ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور ایسی حقیقی سعادت تک پہنچنا ہے جس کو فنا نہیں۔ اسی لئے اللہ نے اس کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹) — اور جس کو حکمت ملی اس کو بڑی خوبی اور دولت ملی۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں "حکمت" سے مراد تفسیرِ قرآن ہے۔

# ان علوم کا بیان جن کی مفسّر کو ضرورت ہوتی ہے

اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کی تفسیر کرنا ہر شخص کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

بعض علماء نے اس میں سختی کی اور کہا کہ ہر شخص کے لئے قرآن کے کسی حصّہ کی (اپنی طرف سے) تفسیر کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ وہ عالم و ادیب ہو اور دلائل، فقہ، نحو اور احادیث کی اس کو خوب معلومات حاصل ہوں۔ ایک مفسّر کو اپنی تفسیر میں صرف وہی اقوال بیان کرنے چاہئیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے ثابت ہیں۔ اس گروہ کے لوگ اپنی دلیل کے طور پر یہ احادیث پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ــ جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی تو وہ اپنا ٹھکانہ (جہنم کی) آگ میں بنالے۔

۲۔ مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِہٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاَ۔ (سنن ترمذی، نسائی) ــ جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اور درست کی پھر بھی اس نے خطا کی۔

۳۔ مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَاْیِہٖ فَقَدْ کَفَرَ۔ ــ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو اس نے کفر کیا۔

نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کونسی زمین مجھے اٹھائے گی اگر میں نے اللہ کی کتاب میں اپنی رائے سے کچھ کہا"۔

اس رائے کے بالمقابل دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ جس شخص کو بھی عربی ادب میں خوب مہارت ہو تو اس کے لئے تفسیر کرنے کی گنجائش ہے، اس لئے کہ عاقل اور ادیب مقاصد جاننے کے لئے خود مکتفی ہیں۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص : ۲۹) | یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ عقل مند نصیحت حاصل کریں۔ |

(اس کے برخلاف) بعض محققین نے ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں اقوال غلو اور کوتاہی اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ اس لئے کہ جو شخص تفسیر میں صرف منقول روایات پر اکتفاء کرے گا تو وہ بہت سی ضروری چیزوں کو چھوڑ دے گا اور جو ہر شخص کو تفسیر کرنے کی اجازت دے گا تو وہ قرآن کو خلط ملط کرنے کے لئے پیش کر دے گا۔ دراصل اس نے مذکورہ بالا آیت "لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ" کی حقیقت کو مدِّ نظر نہیں رکھا۔

اب ضروری ہے کہ ہم پہلے ان امور کو بیان کریں جن پر قرآن مجید مشتمل ہے اور ان علوم کو واضح کریں جن کی ایک مفسر کو ضرورت ہوتی ہے۔ تو اب ہم اللہ کی توفیق سے کہتے ہیں :

ایمان و اسلام کی تمام شرائط جن کی ہمیں دعوت دی گئی ہے اور جن پر قرآن مشتمل ہے، ان کی دو قسمیں ہیں :۔

پہلی قسم : قرآن کے اعتقادی مقاصد کا علم یعنی اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کا علم۔

دوسری قسم : قرآن کے عملی مقاصد کا علم یعنی دین کے احکام کو جاننا اور ان پر عمل کرنا۔ علم ابتداء ہے اور عمل انتہاء ہے۔ علم عمل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور عمل علم کے بغیر خالص نہیں ہوتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اکثر جگہ ایک کو دوسرے کے بغیر ذکر نہیں کیا ہے۔ مثلاً فرمایا :

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا (التغابن : ۹) | جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے۔ |

اور فرمایا:

| | |
|---|---|
| مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ (النحل: ۹۷) | جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحبِ ایمان ہو۔ |

اور فرمایا:

| | |
|---|---|
| اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ | جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوشحالی ہے اور نیک انجامی ہے۔ |

(الرعد: ۲۹)

اِن دو[۲] چیزوں کی معرفت لفظی، عقلی اور وہبی (خداداد) علوم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس لئے سب سے پہلے[۱] ضروری ہے کہ الفاظ کے معانی کا علم حاصل ہو۔ اس کے لئے لغت کا علم ضروری ہے۔

دوسرے[۲] یہ کہ ایک لفظ کی دوسرے لفظ سے مناسبت معلوم ہو۔ اس کے لئے اشتقاق کا علم ضروری ہے۔

تیسرے[۳] یہ کہ الفاظ کے احکام یعنی ان کا معرب ہونا، مبنی ہونا، منصرف ہونا اور اعراب کی حالت کا علم ہو۔ اس کے لئے نحو کا علم ضروری ہے۔

چوتھے[۴] یہ کہ خود تنزیل قرآن یعنی اس کے مختلف الفاظ کا علم ہو۔ اس کے لئے قراءت کا علم ضروری ہے۔

پانچویں[۵] یہ کہ آیات کے نازل ہونے کے اسباب اور انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ماضی کی قوموں کے ذکر پر جو سورتیں مشتمل ہیں ان کی شرح معلوم ہو۔ اس کے لئے تاریخ اور آثار کا علم ضروری ہے۔

چھٹے[۶] یہ کہ قرآن کے مجمل کے بیان میں اور مبہم کی تفسیر میں جو اقوال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اور صحابہ کرامؓ کے منقول ہیں، اُن کا علم ہو۔ یہ علم اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)

اور آپ پر بھی ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں آپ ان کو کھول کر بیان کر دیں۔

اور فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام: ۹۰)

یہ حضرات ایسے تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی سو آپ بھی انہی کے طریقہ پر چلئے۔

اور یہ احادیث و سنتوں کا علم ہے۔

ساتویں[۷] یہ کہ ناسخ و منسوخ، عام و خاص، اجماع و اختلاف، مجمل و مفسّر، شرعی قیاس، کہاں قیاس صحیح ہے اور کہاں صحیح نہیں ہے۔ ان سب کے بارے میں جاننا ضروری ہے اور یہ اصولِ فقہ کے علم سے حاصل ہو گا۔

آٹھویں[۸] یہ کہ دین کے احکام اور اس کے آداب، حقوقِ نفس، رشتہ داری کے حقوق، رعایا کے حقوق اور ان میں اعتدال و توازن قائم کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔ اور یہ فقہ و زہد (تصوّف) کے علم سے حاصل ہو گا۔

نویں[۹] یہ کہ عقلی دلائل، حقیقی براہین، دلائل و مسائل کی تقسیم اور ان کی تعریف، عقلی و ظنّی دلیل میں فرق وغیرہ معلوم ہو۔ یہ علم کلام سے حاصل ہو گا۔

دسویں[۱۰] یہ کہ وہبی (خداداد) علم ہو۔ یہ علم اللہ تعالیٰ اس شخص کو عطا فرماتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: "حکمت نے کہا کہ جو مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس بات پر عمل کرے جو اس کے علم میں سب سے اچھی ہے"۔ پھر حضرت علیؓ نے بطور دلیل یہ آیت تلاوت کی:

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ (الزمر : ۱۸)

یہ وہ لوگ ہیں جو بات کو سنتے ہیں، پھر اس بات پر عمل کرتے ہیں جو اچھی اور نیک ہو۔

حضرت علی رضؓ سے کسی نے سوال کیا کہ "کیا آپ کو نبی کریم علیہ السلام نے کوئی خاص علم عطا کیا ہے جو دوسروں کو نہیں دیا؟ فرمایا: "نہیں۔ میرے پاس صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور جو کچھ میرے صحیفہ (کاغذات وغیرہ) میں ہے اور سمجھ ہے جو اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے"۔ یہی وہ نصیحت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں امید دلائی کہ ہم اسے نیک اعمال کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النحل : ۹۰)

بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا، اور منع کرتا ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے۔ اللہ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور نصیحت پکڑو)۔

اور یہی چیز ہدایت یافتہ افراد کے لئے مزید ہدایت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد : ۱۷)

اور جو لوگ ہدایت پر چلتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو مزید ہدایت دیتا ہے۔

اور یہی وہ طیّب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ہے:

وَهُدُوْۤا اِلَى الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِیْدِ (الحج : ۲۴)

اور انہوں نے ستھری بات کی ہدایت پائی اور تعریفوں والے (اللہ تعالیٰ) کے راستہ کی راہ پائی۔

پس یہ تمام علوم مفسّر کے لئے اوزار کی مانند ہیں۔ فن تفسیر ان کے بغیر پورا نہیں ہو

سکتا اور یہ مندرجہ ذیل دس علوم ہیں :-

لغت ، اشتقاق ، نحو ، قراءت ، تاریخ وسیرت ، حدیث ، اصولِ فقہ ، احکام کا علم یعنی فقہ ، علم کلام ، وہبی علم (خداداد علم) ۔

جس شخص نے اِن دس علوم میں کمال حاصل کر لیا وہ اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کر سکتا ہے اور جو شخص ان دس علوم میں سے کسی ایسے علم میں ناقص ہو جس کا جاننا تفسیر قرآن میں ضروری نہیں ہے ، نیز اس نے اپنے آپ کو ناقص سمجھا اور جو لوگ اس فن میں ماہر ہیں ان سے مدد حاصل کی اور ان کے اقوال سے استفادہ کیا تو پھر وہ انشاء اللہ "اپنی رائے سے تفسیر کرنے والے" ان مفسرین میں شمار نہیں ہوگا جن کی مذمت وارد ہوئی ہے۔

تفسیر بالرائے جس کی مذمت آئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص مذکورہ بالا علوم حاصل نہ کرے اور محض اپنی رائے اور گمان سے اٹکل پچو تفسیر کرنے لگے ۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطا کار قرار دیا اگرچہ اس نے تفسیر میں جو بیان کیا ہے وہ فی نفسہ درست ہو ، اس لئے کہ اس نے بغیر علم کے خبر دی ہے اگرچہ وہ خبر حقیقت کے مطابق ہے ۔ اور یہ مذموم ہے ۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور نہیں کیا :

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف : ۸۶) سوائے ان کے جنہوں نے سچی گواہی دی اور ان کو (صحیح) علم تھا ۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں گواہی دینے کے لئے علم کی شرط لگائی ہے ۔ نیز اللہ تعالیٰ نے منافقین کے اس قول : نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ [۱] (ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں) کی تکذیب کی اور فرمایا :

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ [۲] (اور اللہ گواہی - - - - -

---

[۱] و [۲] سورۃ المنافقون : ۱۔

دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں)۔

حالانکہ منافقین کی گواہی حقیقت کے مطابق تھی لیکن چونکہ ان کا قول ان کے دل کے خیال کے مطابق نہیں تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی تکذیب فرمائی اور اسے جھوٹ قرار دیا۔

حق بات یہ ہے کہ جو شخص تفسیر کا ارادہ کرے تو وہ تقویٰ کو شعار بنائے اور اپنے نفس کی برائیوں اور خود پسندی سے اللہ کی پناہ مانگے، کیونکہ خود پسندی ہر برائی کی جڑ ہے۔ نیز یہ کہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور قرآن کے نازل ہوتے کا مشاہدہ کیا ان کی رائے اور فہم کو غلط قرار دینے کے بجائے اپنی رائے و فہم کو زیادہ غلط قرار دے۔ اللہ ہی سے توفیق ملتی ہے۔

# ایک عبارت سے دو مختلف معنی مراد لینا

جو عبارت دو معنی میں مشترک ہو، وہ دونوں میں حقیقت ہوگی یا ایک معنی میں حقیقت اور دوسرے معنی میں مجاز۔

اگر دونوں معنی مراد میں ایک دوسرے کے مخالف ہوں تو ایک عبارت سے دونوں معنی کو ایک ساتھ مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ ”نماز پڑھو“، اور اس ایک ہی نماز کو واجب بھی کہا جائے اور مندوب بھی۔ اب یہ نماز واجب ہوگی یا مندوب دونوں طرح مراد نہیں لے سکتے۔

لیکن اگر دونوں معنی باہم مخالف نہ ہوں تو دونوں معنی مراد لے سکتے ہیں۔ جیسے قرآن میں لفظ ”لمس“ ہے[1]۔ اس کے معنی ہیں چھونا۔ اس سے جماع بھی مراد لے سکتے

[1] یعنی آیت ”اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ“ میں۔ (نساء ۴۲، مائدۃ ۶:)

ہیں اور ہاتھ سے چھونا بھی مراد لے سکتے ہیں۔ اور یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں، اس لئے ایک ہی آیت سے ایک ساتھ یہ دونوں معنی مراد لے سکتے ہیں۔ امام شافعیؒ اسی طرف گئے ہیں۔ نیز یہ سیبویہؒ کے مذہب کے بھی مطابق ہے۔ اس لئے کہ سیبویہؒ نے عرب کے قول "اَلْوَیْلُ لَہٗ" کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ یہ کسی کے لئے بد دعا بھی ہے اور اس کے حال کی خبر بھی ہے۔ تو یہاں سیبویہؒ نے ایک لفظ کو ایک حالت میں دو معنی کے لئے قرار دیا۔ اس کے علاوہ سیبویہؒ کا مزید کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے جواز پر مزید دلائل یہ ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ "اِفْعَلُوْا" یعنی کام کرو، اور یہ خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ (حالانکہ یہ صیغہ مذکر کا ہے)۔ نیز عرب کہتے ہیں: "اَلرِّجَالُ وَالنِّسَآءُ فَعَلُوْا"۔ اس میں لفظ فَعَلُوْا (جو صیغۂ مذکر ہے) مردوں کے لئے حقیقت اور عورتوں کے لئے مجاز ہے۔ اور ایک ہی لفظ سے بیک وقت حقیقی و مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ — اے نبی جب تم (لوگ) طلاق دو عورتوں کو۔

(الطلاق: ۱)

اس آیت میں اوّل خطاب نبیؐ سے ہے اور "طَلَّقْتُمْ" (صیغۂ جمع) سے مؤمنین بھی مراد ہیں۔ تو لفظ "طَلَّقْتُمْ" سے نبیؐ مراد لینا حقیقت اور مؤمنین مراد لینا مجاز ہے۔

ایک شاعر کا شعر ہے:

ثِقَالُ الْجِفَانِ وَالْحُلُوْمِ رَحَاهُمْ — رَحَى الْمَاءِ يَكْتَالُوْنَ كَيْلًا عَذَمْذَمَا

(بھاری طشت اور عقلوں والے، ان کی چکی پانی کی چکی ہے، وہ محض قیاسی (یا ناقص) پیمانہ سے ماپ کر دیتے ہیں)۔

اس شعر میں شاعر نے "جفان" (طشت) اور "حلوم" (عقول) دونوں کی صفت "ثقال" بیان کی ہے لیکن یہ صفت "جفان" کے لئے حقیقت اور "حلوم" (عقلوں) کے لئے مجاز ہے۔ پھر بھی اس نے دونوں معنی کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کیا ہے۔

دوسرے شاعر کے شعر کا ایک حصہ ہے کہ "وَمَاءِ اٰجِنِ الْجَمَّاتِ قَفْرٍ"
(یعنی بہت زیادہ گدلے پانی کے چشمے اور خالی مکانات) اس شعر میں لفظ ماء کو پانی کے چشمہ اور اس کی جگہ دونوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ عربی میں چشمہ کو اور جس جگہ چشمہ ہوتا ہے دونوں کو ماء کہتے ہیں۔ "ماء" سے چشمہ مراد لینے کی دلیل "اٰجن الجمات" بہت زیادہ گدلا پانی اور جگہ مراد لینے کی دلیل لفظ "قفر" بمعنی خالی ہے کیونکہ "قفر" چشمہ کی صفت نہیں ہو سکتی۔ ایک اور شاعر ابن ہرمۃ نے کہا ؎

وَالْحُوْتُ یَسْبَحُ فِی السَّمَا ءِ کَسَبْحِہٖ فِی الْمَاءِ

(مچھلی آسمان میں تیرتی ہے جس طرح اس کا پانی میں تیرنا ہے)

شاعر نے یہاں لفظ "حوت" سے آسمان کی مچھلی اور پانی کی مچھلی دونوں مراد لی ہیں حالانکہ آسمان کی مچھلی پانی کی مچھلی سے الگ چیز ہے۔ آسمانی مچھلی سے مراد بُرجِ حُوت ہے۔

عرب کہتے ہیں "اَلْقَمَرَان" یعنی سورج و چاند۔ یہ لفظ سورج کے لئے لامحالہ مجاز ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ متکلم ایک حالت میں ایک لفظ سے اس کے حقیقی موضوع لہ معنی مراد لے اور اس معنی سے ہٹ کر اسی حالت میں دوسرے معنی بھی مراد لے، کیونکہ پھر ایک مراد میں دو مخالف امر جمع ہو جائیں گے۔ اس کے ناجائز ہونے کے لئے یہی عمدہ دلیل ہے۔

اس کا یہ جواب دیا گیا کہ ایک ہی لفظ کے ایک معنی کو موضوع لہ حقیقی اور منقولی کہنا

صحیح نہیں ہے لیکن اگر لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ایک لفظ سے بیک وقت ایک معنی بطور نقل کے اور دوسرے معنی بطور حقیقی وموضوع لہ کے مراد لے رہے ہیں تو یہ صحیح ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

پھر متکلم کے لئے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ وہ کلام کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ یہ لفظ اس معنی میں حقیقت ہے یا مجاز۔ نیز اگر لفظ دو معنی میں مستعمل ہے تو یہ سوچے کہ یہ لفظ دونوں میں حقیقت ہے یا ایک میں مجاز ہے (اور دوسرے میں حقیقت)۔ ہاں الفاظ کی مناسبت کی رعایت کرتے ہوئے ایسے عام معنی سوچ سکتا ہے جو ان دونوں معانی کو شامل ہو۔ جیسے کہا جائے کہ "شیر اور گدھے سے بچو" اور شیر سے کوئی بہادر جانور اور گدھے سے کوئی بیوقوف جانور مراد لے۔ اس لئے کہ بہادری وبے وقوفی جس طرح انسانوں میں ہوتی ہے اسی طرح جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ اس لئے مجاز میں دونوں کو مراد لینا صحیح ہے، جس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ بہادر جانور اور بے وقوف جانور۔

اس اصول پر قرآن کی اس آیت کو مراد لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔ تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جتنے ان میں ہیں سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں (اس کی تسبیح کرتے ہیں)۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)

یہ تسبیح انسان اور غیر انسان دونوں کے لئے عام ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ انسان اپنی زبان اور افعال سے تسبیح کرتا ہے جبکہ جمادات کی تسبیح اس کے علاوہ (دوسرے طریقہ سے انجام پاتی) ہے لیکن دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ میں ملادیا۔ اسی اصول پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:۔

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى (الضحیٰ: ۸) اور (اللہ نے) تجھ کو مفلس پایا پھر تجھے غنی کر دیا۔

کہا گیا ہے کہ یہاں دل کا غنی (یعنی قناعت) اور مال کا غنی دونوں ایک ساتھ مراد ہیں۔ اس قسم کی مثالیں قرآن میں بے شمار ہیں۔ کئی معانی ایک لفظ میں جمع ہوں اس کی مثال قرآن شریف سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان: ۲۷) | اور زمین میں جتنے درخت ہیں یہ قلم ہوں اور یہ سمندر اور اس کے علاوہ سات اور سمندر (سیاہی) ہوں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔ |

اسی اصول کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| لِكُلِّ اٰیَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ وَمُطَّلَعٌ | ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر حرف کی ایک حد و غایت ہے اور ہر غایت و مقصد کو جاننے کا ایک راستہ اور ذریعہ ہوتا ہے۔ |

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ ایک لفظ کے تحت بہت سے معنی جمع ہوتے ہیں۔

# اعجاز القرآن

## یعنی قرآن کا معجزہ ہونا

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزوں کی دو قسمیں ہیں۔ حسی[1] اور عقلی[2]۔

حسی[1] معجزہ سے مراد وہ معجزہ جسے آنکھ کے ذریعہ محسوس کیا جا سکے جیسے حضرت صالحؑ کی اونٹنی، حضرت نوحؑ کا طوفان، حضرت ابراہیمؑ کی آگ، حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی۔

عقلی[2] معجزہ سے مراد وہ جس کا معجزہ ہونا عقل سے معلوم ہو۔ جیسے اشاروں میں یا

وضاحت سے غیب کی خبریں دینا، کسی سے سیکھے بغیر علوم کے حقائق بیان کرنا۔

حسی معجزہ کا ادراک خاص و عام ہر شخص کر سکتا ہے اور یہ عام لوگوں کے نزدیک زیادہ اہم، دلوں کو زیادہ لگنے والا اور عام لوگوں کی سمجھ میں زیادہ جلدی آنے والا ہوتا ہے۔ مگر یہ کہ اس کے حقیقی معجزہ ہونے اور کہانت یا شعبدہ یا جادو یا اتفاق یا حسابی حیلہ یا نظر بندی یا مسمریزم ہونے میں فرق مشکل سے ہوتا ہے۔ ان میں وہی شخص فرق کر سکتا ہے جس کو ان تمام چیزوں کے بارے میں خوب معلومات ہوں۔

عقلی معجزہ کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اعلیٰ عقلی صلاحیتوں کے مالک ہوں، انتہائی سمجھ دار اور زیرک ہوں، صاحبِ غور و فکر ہوں اور جنہوں نے حق کی بات کی پرکھ اور پہچان میں اپنی عمریں کھپا دی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اکثر معجزے حسی رکھے تھے کیونکہ اس قوم کی عقل کمزور تھی اور ان میں بصیرت کم تھی لیکن اِس امت کے اکثر معجزات عقلی رکھے کیونکہ اِس امت کی عقل و سمجھ اتنی کامل ہے کہ وہ اس کی بدولت انبیاء کی طرح ہو گئی۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَادَتْ اُمَّتِیْ تَكُوْنُ اَنْبِيَاءَ میری امت انبیاء ہونے کے قریب ہے۔

(مسند احمد)

نیز یہ شریعت چونکہ قیامت تک باقی رہے گی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی اور عقلی امور بھی باقی رہتے ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہوتی، لہٰذا اس امت کے اکثر معجزے بھی عقلی رکھے تاکہ وہ باقی رہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی معجزات جیسے آپ کے ہاتھ میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، بھیڑیوں کا آپ سے بات کرنا، درخت کا آپ کی طرف چل کر آنا وغیرہ تو ان معجزات کو آپؐ کے اصحابؓ اور محدثین نے شمار کیا ہے، لیکن آپ کے عقلی معجزات بے شمار ہیں۔ جو شخص بھی آپ کی جامع و مختصر کلمات والی

حکمتوں پر غور کرے گا کہ جن کے مثل بیان کرنے سے قوموں کے حکماء عاجز ہو گئے ہیں، تو وہ عجیب و غریب باتوں سے واقف ہو گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے خاص معجزہ قرآن مجید ہے۔ یہ حسی معجزہ بھی ہے اور عقلی بھی، خاموش بھی ہے اور (ناطق) بولنے والا بھی ہے، یہ قیامت تک باقی رہنے والا اور پورے عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (العنکبوت: ۵۰-۵۱)

وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے کچھ نشانیاں (معجزات) کیوں نہیں اتریں، تم کہہ دو کہ نشانیاں (اتارنا) تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور میں تو بس کھول کر ڈر سنانے والا ہوں۔ کیا ان کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر ایک ایسی کتاب اتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

اگرچہ عرب بیان و اظہار خیال میں ماہر تھے پھر بھی اللہ نے انہیں دن رات قرآن کے مقابلہ میں اس کے مثل لانے کے لئے چیلنج دیا اور للکارا۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرۃ: ۲۳)

اگر تم کو اس کلام میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت (ہی) بنا لاؤ اور (اس مقصد کے لئے) اللہ کے سوا اپنے (دوسرے) مددگاروں کو بلا لاؤ۔ اگر تم سچے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ

کہہ دو کہ پھر تم بھی اسطرح کی ایک سورت بنا لاؤ

اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس: ۳۸) — اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو

اور فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (الاسراء: ۸۸)

کہہ دیجئے اگر آدمی اور جن اس (کام) پر مجتمع ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن (بنا) لائیں تو (ہرگز) ایسا قرآن (بنا کر) نہیں لا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی (اس کام میں) مدد کریں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کا مثل لانے سے ان کی عاجزی اور ناکامی کو رسالت کی نشانی بنایا۔ اگر کفار واقعی اس پر قادر ہوتے کہ قرآن کا مثل لے آئیں تو وہ اس کا مثل لانے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے کیونکہ انہوں نے رسالت کی روشنی کو بجھانے اور اسے کمزور کرنے کے لئے سر توڑ کوششیں کیں۔ ان کی کوششوں کے بارے میں اللہ نے خبر دی کہ کبھی وہ کہتے ہیں کہ

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ (حٰمٓ سجدة: ۲۶)

اس قرآن کی طرف کان نہ دھرو (نہ اس کو سنو) بلکہ اس کے پڑھے جانے کے وقت بک بک کرو اور گڑبڑ کرو۔

کبھی وہ کہتے:

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (الانفال: ۳۱)

اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسا کلام کہہ لیں۔

اور کبھی وہ قرآن کے بارے میں کہتے:

اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (النحل: ۲۴)

یہ اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

اور کبھی کہتے کہ

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (الفرقان: ۳۲) اس پر قرآن سارا کا سارا ایک جگہ ہو کر کیوں نہ اترا۔

اور کبھی کہتے:

اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (یونس: ۱۵) (اے محمد!) اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن لے آیا، یا اسی کو بدل دے (اور ہمارے عقائد کے مطابق کر دے)۔

مشرکینِ مکّہ اور کفارِ عرب نے یہ سب باتیں قرآن کا مِثل لانے سے عاجز ہو کر کہیں۔ اِس سے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ قرآن کے مثل کوئی کلام لانے سے عاجز و قاصر رہے۔ یہ کہنا محال ہے کہ کفّار نے قرآن کا مِثل پیش کیا لیکن وہ ہم تک منقول نہیں ہوا۔ اس لئے کہ لوگ تو ہر چھوٹی بڑی چیز نقل کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ہم نے بہت سی کتابیں دیکھی ہیں جو اسلام پر اعتراضات سے بھری ہوئی ہیں اور عرب میں ہر مخالفِ اسلام بات جو کہی گئی ہے، منقول ہوئی اور مشہور رہی۔

یہ مذکورہ بحث اگرچہ قرآن کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتی ہے لیکن اس سے پوری تشفی نہیں ہوتی۔ البتہ دو امور کی تفصیل کے بعد تشفی بھی حاصل ہو جائے گی۔

**پہلا امر:۔** معجزہ کی وضاحت۔ معجزہ لفظ ہے یا معنی یا نظم یا تینوں چیزیں؟ اس لئے کہ ہر منظوم کلام ان تینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

**دوسرا امر:۔** معجزہ کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو (کسی بشر کے) امکان و قدرت میں نہیں جیسے مردہ کو زندہ کرنا اور کسی جسم کو بغیر کسی مادہ وصورت کے پیدا کرنا۔ اور دوسری قسم جو (کسی بشر کے) دائرۂ امکان و قدرت میں ہوتی ہے وہ سب سے افضل قسم و نوع ہے، اور افضل نوع کی اپنے سے کم تر نوع سے نسبت بالکلیہ ختم نہیں ہوجاتی بلکہ کچھ نہ کچھ نسبت باقی رہتی ہے اگرچہ یہ نسبت بہت چھوٹی ہو جیسے ہزار میں

سے ایک۔ پس ایک ماہر بڑھئی اگرچہ اپنے کمال کو نہ پہنچے معجزہ دکھانے والا نہیں ہوسکتا جبکہ کوئی دوسرا شخص اس بڑھئی جیسا کام کرسکے۔

تو اب ہم اللہ کی توفیق سے کہتے ہیں:

قرآن کا معجزہ ہونا دو طرح سے ہے۔ ایک طرح سے اس کا معجزہ ہونا اس کی فصاحت سے متعلّق ہے۔ دوسری طرح اس کا معجزہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس کا مقابلہ کرنے سے روک دیا گیا۔

فصاحت کے ذریعہ قرآن کا معجزہ ہونا اس کے الفاظ و معانی کے عنصر سے متعلّق نہیں ہے، اس لئے کہ قرآن کے سب الفاظ وہی ہیں جو عرب کے الفاظ ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (طٰہٰ: ۱۱۳) قرآن عربی زبان میں ہے۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (البقرۃ: ۱و۲) یہ کتاب ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتانے کے لئے فرمایا کہ یہ کتاب ان حروف سے مرکّب ہے جو کلام کا مادہ ہیں۔

قرآن کا معجزہ ہونا معانی سے بھی متعلّق نہیں ہے کیونکہ ان میں سے بہت سے معانی سابقہ کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (الشعراء: ۱۹۶) اور یہ سب پہلوں کی کتابوں میں (بھی) لکھا ہوا ہے۔

اور فرمایا:

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ: ۱۳۳) کیا ان کے پاس اگلی کتابوں والے دلائل نہیں پہنچ چکے۔

قرآن مجید از روئے معنیٰ بھی معجزہ نہیں ہے، جیسے غیب کی خبر دینا۔ کیونکہ غیب کی خبر کا معجزہ ہونا قرآن ہونے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ غیب کی خبر دینا خود ایک معجزہ ہے خواہ وہ قرآن کے نظم کے ساتھ ہو یا کسی اور نظم کے ساتھ، نیز خواہ فارسی میں ہو یا عربی میں یا کسی دوسری زبان میں، خواہ اشاروں میں ہو یا صریح عبارت میں۔ ہر لحاظ سے غیب کی خبر دینا خود ایک مستقل معجزہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن اپنے خاص نظم وترکیبِ الفاظ کے ساتھ قرآن ہے، جس طرح شعر کے لئے خاص نظم ہوتا ہے اور خطبہ کے لئے خاص نظم وترتیب۔

پس نظم وترکیب قرآن کی صورت ہے اور لفظ ومعنی اس کا عنصر و مادّہ ہیں۔ اور صورتوں کے مختلف ہونے سے چیزوں کا حکم اور نام بدل جاتا ہے۔ جیسے انگوٹھی، بالی، کنگن کہ ان سب کے نام اور حکم مختلف ہیں کیونکہ ان کی صورتیں مختلف ہیں حالانکہ ان کا عنصر ایک ہی ہے یعنی سونا اور چاندی۔ اس بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ قرآن کا معجزہ ہونا اس کے مخصوص نظم وترتیب وترکیب کے ساتھ متعلّق ہے۔

اب قرآن کے معجزہ کو بیان کرنے کے لئے کلام کے نظم کو بیان کرتے ہیں۔ پھر ہم یہ بیان کریں گے کہ قرآن کا یہ نظم بقیہ تمام قسم کے نظم وترکیب سے مختلف ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ کلام کو مرکّب کرنے کے پانچ درجے ہیں:۔

پہلا درجہ:۔ حروفِ تہجی کو ملانا تاکہ اس سے تین کلمات اسم فعل اور حرف بنیں۔

دوسرا درجہ:۔ ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے ملانا تاکہ اس سے مفید مطلب جملہ حاصل ہو (جس کے معنی ہوں)۔ اکثر لوگ اپنے خطاب اور ضروریات کو پورا کرنے میں اسی نوع کو استعمال کرتے ہیں۔ اِسے نثری کلام کہتے ہیں۔

تیسرا درجہ:۔ الفاظ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان کی ابتداء وانتہاء

اور ان کے حروف کے مخارج کی مناسبت کا لحاظ ہو۔ اسے منظوم کہتے ہیں۔

**چوتھا درجہ:۔** کلمات کو ترتیب دیتے ہوئے کلام کے آخر میں ایک جیسے حروف لائے جائیں اسے مسجّع کہتے ہیں۔

**پانچواں درجہ:۔** کلمات کو مخصوص وزن کے ساتھ نظم کیا جائے۔ اسے شعر کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کلام یا تو صرف نثر ہو گا یا نثر کے ساتھ نظم بھی ہو گی یا نظم کے ساتھ سجع بھی ہو گی یا سجع کے ساتھ وزن بھی ہو گا (جسے شعر کہتے ہیں)۔

منظوم کلام یا تو گفتگو ہو گی اسے خطابت کہتے ہیں، یا مکاتبت ہو گی اسے خط و پیغام کہتے ہیں۔ کلام کی انواع یہی ہیں اور ہر نوع کا ایک خاص نظم ہے۔

قرآن اپنے خاص نظم کے ساتھ ان تمام انواع کے محاسن کو حاوی ہے لیکن اس کا نظم مذکورہ انواع کا نظم نہیں ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ خط (مکتوب) ہے، یا شعر ہے یا خطابت ہے۔ ہاں اسے کلام کہنا صحیح ہے۔ جس نے کلام کی تمام انواع کو سُن رکھا ہو وہ قرآن اور دوسری انواعِ کلام کے درمیان فرق کرسکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ — اور وہ ایک نادر کتاب ہے۔ اس میں جھوٹ کا دخل نہیں آگے سے اور نہ پیچھے سے۔

(حٰمٓ السجدۃ: ۴۱: ۴۲)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کے کلمات کی ترتیب انسانوں کے نظمِ کلام کی طرح نہیں ہے کہ اس میں اضافہ کرنا ممکن ہو جس طرح دوسری کتابوں کا حال ہوتا ہے کہ ایک کتاب کے طرز پر دوسری کتاب لکھ دی جاتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ قرآن کے نظم میں شعر کے اوزان کی پیروی کیوں نہیں کی گئی، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ منظوم موزوں کلام کا مرتبہ، غیر موزوں کلام سے اعلیٰ ہے، اس لئے کہ ہر

موزوں منظوم ہوتا ہے جبکہ ہر منظوم موزوں نہیں ہوتا۔

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ قرآن میں شعر کے اوزان ونظم سے اس لئے اجتناب کیا گیا ہے کہ شعر کی خاصیت حکمتِ الٰہی کے منافی ہوتی ہے، اس لئے کہ قرآن سچائی کا اقرار کرنے والا اور حق کی کان ہے جبکہ شاعر کا مقصد باطل چیز کو حق کی صورت میں پیش کرنا اور مدح وذم میں حق کو استعمال کئے بغیر حد سے آگے نکل جانا ہوتا ہے، یہاں تک کہ شاعر حق اور سچی بات بھی ضمناً کہتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جس کی قوتِ خیالی زیادہ ہوگی وہ شعر کہنے پر زیادہ قادر ہوگا اور جس کی قوتِ عاقلہ زیادہ ہوگی وہ شعر کہنے میں زیادہ کوتاہ ہوگا۔ نیز چونکہ شعر جھوٹ کے اقرار کا مرکز ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے دور رکھا کیونکہ آپ تو سچی بات کو مزین کرنے والے نیز اللہ کی مخلوق اور اللہ کے درمیان واسطہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ — اور ہم نے اس کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ یہ اس کے لائق ہے۔

(یٰسٓ : ۶۹)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کی ضرورت کی نفی کردی۔ اور فرمایا:

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ — اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

(الحاقۃ : ۴۱)

یعنی وہ جھوٹ بولنے والے نہیں ہیں[1]۔ اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ قرآن شعر نہیں

---

[1] شاعروں کی مذمت کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (یعنی شاعروں کی پیروی تو گمراہ کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں حیران وپریشان پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ (الشعراء: ۲۲۴-۲۲۶)

ہے۔ کیونکہ اہل عرب کے لئے شعر کے اوزان اتنے واضح وظاہر تھے کہ ان کو شعر اور غیر شعر میں اشتباہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس کی نفی کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پہلے سے فرق کرتے آرہے تھے۔ شعر جھوٹ کے ساتھ اتنا مشہور ہو گیا کہ وہ قیاس جو جھوٹ اور باطل نتیجہ دیتا ہے اسے بھی اہل کلام ومنطق شعری قیاس کہتے ہیں۔ قرآن میں بعض کلمات جو موزوں آئے ہیں وہ اتفاقیہ طور پر ضمناً آئے ہیں ان کی حقیقت شعر نہیں ہے۔ اس بارے میں علماء نے کلام کیا ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔

قرآن کا دوسری طرح معجزہ ہونا یعنی لوگوں کو اس کا مقابلہ کرنے سے روک دینا۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ کوئی فن یا کام خواہ محمود (پسندیدہ) ہو یا مذموم (ناپسندیدہ)، اس فن اور اس سے متعلق افراد کے درمیان ایک مخفی مناسبت اور خدائی توفیق ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک شخص کسی پیشہ کو ترجیح دیتا ہے تو اس لئے کہ اس کیلئے اسکا شرح صدر ہو جاتا ہے، اس کی قوتیں اس کام کو کرنے میں اس کی تابع ہوتی ہیں اور وہ اس کام کو خوش دلی اور شرح صدر کے ساتھ کرتا ہے[۱]۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بیان کیا گیا ہے فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (المائدۃ: ۴۸)
تم میں سے ہر اک کو ہم نے ایک دستور اور راہ دی ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ فرمایا:

اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ (صحیح بخاری)
عمل کرو اس لئے کہ جو جس عمل کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ عمل اسکے لئے آسان کر دیا گیا ہے۔

جب (عرب کے) اہل بلاغت وخطابت (شعراء ومقررین وبلغاء) کو جو کہ ہر قسم کے

---

[۱] اسی مضمون کی یہ آیت ہے: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریق پر عمل کرتا ہے) (بنی اسرائیل: ۸۴)

معانی کی وادیوں میں اپنی زبان آوری سے چکر لگاتے تھے، قرآن پیش کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک گروہ کو قرآن کے مقابلہ کی دعوت دی اور پھر انہیں قرآن جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز کر دیا اور ان کی طبیعتیں قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی نہ کر سکیں، تو یہ بات کسی عقلمند پر مخفی نہیں ہوگی کہ کسی خدائی قدرت نے انہیں اس سے پھیر دیا۔ اور اس سے بڑا کیا معجزہ ہوگا کہ تمام اہلِ بلاغت کو ظاہر میں قرآن کا مقابلہ کرنے کا اختیار دیا گیا اور باطن میں انہیں اس کا مقابلہ کرنے سے روک دیا گیا۔ ان کی حالت کے کیا ہی مناسب یہ شعر ہے جو ابو تمام نے اپنے دیوان میں لکھا ہے ؎

فَإِنْ نَكُ أُهْمِلْنَا فَأَضْعِفْ بِسَعْيِنَا ۔۔۔ وَإِنْ نَكُ أُجْبِرْنَا فَفِيمَ تُتَعْتَعُ

(اگر ہمیں کام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو ہماری کوشش کیا ہی ضعیف ہے اور اگر ہمیں مجبور کر دیا جائے (اور روک دیا جائے) تو ہمیں کس وجہ سے ملامت کی جاتی ہے)[۱]

اب میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ ہی توفیق دینے والا اور حفاظت کرنے والا ہے۔

---





[۱] اسی کے ہم معنی اردو میں میر تقی میر کا شعر ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ۔۔۔ چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

# ○ قابل قدر دینی و علمی کتابیں ○

○ اجتہاد [ (۱) اجتہاد کا تاریخی پس منظر (۲) مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر ] از مولانا محمد تقی امینیؒ

○ حدیث کا درایتی معیار ۔ از مولانا محمد تقی امینیؒ

○ حجۃ اللہ البالغہ مترجم (عربی مع اردو) از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

○ بدعت کی حقیقت اور اس کے احکام ۔ از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

○ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی مع اردو)
از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

○ امام ابوحنیفہ اور ان کے ناقدین ۔ از مولانا حبیب الرحمٰن شروانی

○ تحفۃ الواعظین (اردو) از علامہ ابن جوزیؒ

○ تازیانۂ شیطان ۔ از مولانا احمد سعید دہلویؒ

○ اسباب زوال امت از امیر شکیب ارسلان

○ کتاب الصلوٰۃ (اردو) از امام احمد بن حنبلؒ

○ احکام الجنائز (اردو)

○ مختصر شعب الایمان (اردو)

○ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے علمائے حق
از مولانا محمد منظور نعمانی

# الفوز الکبیر

# فی

# اصول التفسیر

(اُردو)

جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے تمام بنیادی اصول پر مفصل اور بصیرت افروز بحث کی گئی ہے

تالیف

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ

مترجم

مولوی رشید احمد صاحب انصاری

قدیمی کتب خانہ